فہرست

اس شمارے میں

اس شمارے میں	نعیم احمد	۴

قرآنیات

البیان: یوسف ۱۲: ۱-۲۲ (۱)	جاوید احمد غامدی	۵

معارف نبوی

خدا ترسی اور خشیت الٰہی کے بارے میں روایات	امین احسن اصلاحی	۱۵
تعظیم خداوندی کے تقاضے	معز امجد / شاہد رضا	۱۷

سیر و سوانح

حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ	محمد وسیم اختر مفتی	۱۹

نقطۂ نظر

عورت کی دیت	پروفیسر خورشید عالم	۳۱
بعد از موت (۳)	رضوان اللہ	۴۱

ادبیات

ایک سخت گیر آقا	مولانا الطاف حسین حالی	۴۹

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

نعیم احمد

''قرآنیات'' میں حسب سابق جناب جاوید احمد غامدی صاحب کا ترجمۂ قرآن ''البیان'' شائع کیا گیا ہے۔ یہ قسط سورۂ یوسف (۱۲) کی آیات ۱۔۲۲ کے ترجمہ اور حواشی پر مشتمل ہے۔ ان آیات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت یوسف علیہ السلام کی سرگذشت سے آگاہ کیا ہے۔ اس کے سنانے کا مقصد ان باتوں کا جواب دینا تھا جو اس دور میں لوگوں کے ذہنوں میں نبی اور آپ کی دعوت سے متعلق پیدا ہو رہے تھے۔ اس سرگذشت میں ان کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔

''معارف نبوی'' میں ''موطا امام مالک'' کی جس روایت کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس میں بیان ہوا ہے کہ اپنی ذات کا احتساب، اصل تقویٰ کی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے میں کامیابی ہے، ورنہ سخت عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ''معارف نبوی'' ہی کے تحت معز امجد صاحب کا مضمون ''تعظیم خداوندی کے تقاضے'' شامل اشاعت ہے۔ اس میں بیان ہوا ہے کہ بوڑھے مسلمان، حافظ قرآن اور منصف حکمران کی تعظیم کرنا، اللہ تعالیٰ کی تعظیم میں سے ہے۔

''سیر وسوانح'' کے تحت محمد وسیم اختر مفتی صاحب کے مضمون میں جلیل القدر صحابی حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے اور غزوات میں ان کی شرکت کا ذکر ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے ہجرت حبشہ کے واقعے اور حالات زندگی کو بیان کیا گیا ہے۔

''نقطۂ نظر'' کے تحت پروفیسر خورشید عالم صاحب نے اپنے مضمون ''عورت کی دیت'' میں بیان کیا ہے کہ عورت کی نصف دیت کا جو تصور عام طور پر رائج ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اسلام نے دیت کی مقدار متعین نہیں کی ہے اور نہ ہی مرد اور عورت کی دیتوں میں کسی فرق کی پابندی کو لازم ٹھہرایا ہے۔ ''نقطۂ نظر'' ہی کے تحت رضوان اللہ صاحب نے اپنے مضمون ''بعد از موت'' کے تیسرے حصے میں عقیدۂ اِحیا کو بیان کیا ہے۔ اس کے مطابق انسانی روح ایک نئے انسانی جسم اور نئی دنیا میں دوبارہ زندگی پائے گی۔ یہ عمل اس دنیا کے خاتمے کے بعد ہوگا۔

''ادبیات'' میں الطاف حسین حالی کی نظم شائع کی گئی ہے۔ اس میں انھوں نے ایک بے رحم آقا کے ظلم وستم کو بیان کیا ہے جو اپنے نوکروں سے کام لینے کے معاملے میں انھیں کسی قسم کی بھی سہولت دینے کا روادار نہ تھا۔

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ یوسف

(۱)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓرٰ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ﴿۱﴾ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ قُرۡءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۲﴾

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورہ 'الٓرٰ' ہے[۱]۔ یہ اُس کتاب کی آیتیں ہیں جو اپنا مدعا پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ ہم نے اِس کو عربی زبان میں قرآن بنا کر اتارا ہے تاکہ، (اے قریش مکہ)، تم اِس کو اچھی طرح سمجھ سکو[۲]۔ ۱-۲

۱۔ سورۂ یونس اور سورۂ ہود کی طرح اِس سورہ کا نام بھی 'الٓرٰ' ہے۔ اِس سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ اِس کا مضمون بھی اصلاً وہی ہے جو پچھلی سورتوں میں زیر بحث رہا ہے۔ اِس نام کے معنی کیا ہیں؟ اِس کے متعلق اپنا نقطۂ نظر ہم سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔

۲۔ سورہ کے مخاطب قریش ہیں۔ یہ اُنھی پر امتنان و احسان کا اظہار ہے جس میں یہ تنبیہ بھی چھپی ہوئی ہے کہ نہیں سمجھو گے تو یاد رکھو، اِس کے بعد تمھارے پاس کوئی عذر نہیں ہوگا جسے خدا کے حضور میں پیش کر سکو۔

نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَیۡکَ اَحۡسَنَ الۡقَصَصِ بِمَاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ وَاِنۡ کُنۡتَ مِنۡ قَبۡلِہٖ لَمِنَ الۡغٰفِلِیۡنَ ﴿۳﴾ اِذۡ قَالَ یُوۡسُفُ لِاَبِیۡہِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیۡ رَاَیۡتُ اَحَدَ

(اے پیغمبر)، اِس قرآن کی بدولت جو ہم نے تمھاری طرف وحی کیا ہے، ہم تمھیں ایک بہترین سرگذشت[۳] سناتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ (اِس طرح کی چیزوں سے) تم اِس سے پہلے بالکل بے خبر

۳؎ یہ کس لحاظ سے بہترین سرگذشت ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کے جن پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے، اُن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ اِس میں حسن و عشق کی چاشنی ہے، مگر یوسف علیہ السلام جو اِس قصے کا مرکزی کردار ہیں، اُن کی شخصیت اِسے پاکیزگیِ سیرت و کردار کا ایک ایسا مرقع بنا دیتی ہے کہ پڑھنے والا اِس کے اندر اپنے ایمان کے لیے غذا اور اپنی روح کے لیے لذت و حلاوت محسوس کرتا ہے۔

۲- یوسف علیہ السلام کی فطرت کے جو جوہر اِس قصے میں نمایاں ہوتے ہیں، وہ ایسے شان دار ہیں کہ ہر پڑھنے والے کے اندر اُن کی تقلید کا جذبہ ابھرتا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ یہ تقلید ناممکن نہیں، بلکہ ممکن محسوس ہوتی ہے۔

۳۔ یہ سرگذشت بتاتی ہے کہ انسان کا ظاہری حسن تو زنانِ مصر کی آنکھیں بھی دیکھ لیتی ہیں، لیکن اُس کے باطن کا حسن اُس وقت نمایاں ہوتا ہے، جب وہ زندگی کے مختلف مراحل میں اُس کی آزمایشوں سے گزرتا ہے۔ سیدنا یوسف کی شخصیت کا یہ حسن بھی اِسی طرح نمایاں ہوا ہے اور اِس سرگذشت میں وہ ذہانت، صداقت، پاکیزگی، پاک دامنی اور انتقام کی قدرت کے باوجود عفو و درگذر کی ایک زندہ جاوید مثال بن کر ابھرے ہیں۔

۴۔ اِس میں جو حالات و واقعات پیش آئے ہیں، وہ نہایت حیرت انگیز ہیں، مگر کسی جگہ محسوس نہیں ہوتا کہ اُن میں کوئی چیز بے جوڑ اور بے ربط ہو گئی ہے یا حالات کی فطری رفتار کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔

۵۔ اِس کے اولین مخاطبین قریش تھے۔ اُن کے لیے تو گویا اِسے ایک آئینہ بنا دیا گیا ہے، جس میں وہ اپنی عاقبت بھی دیکھ سکتے تھے اور اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل بھی۔ اِس لحاظ سے یہ ایک صریح پیشین گوئی تھی جسے آیندہ دس سال کے واقعات نے حرف بہ حرف صحیح ثابت کر کے دکھا دیا۔ چنانچہ اِس کے نزول پر ڈیڑھ دو سال ہی گزرے تھے کہ قریش نے برادرانِ یوسف کی طرح دارالندوہ میں رسول اللہ کے قتل کی سازش کی، مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اُن

عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ﴿۴﴾ قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ

تھے۔[۴] یہ اُس وقت کا قصہ ہے، جب یوسف نے اپنے باپ[۵] سے کہا: ابا جان، میں نے خواب دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے ہیں اور سورج اور چاند ہیں۔ میں نے اُن کو دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں[۶]۔

کے شر سے محفوظ رکھا۔ آپ مکہ سے نکلے اور غار ثور میں جا چھپے۔ اِس کے بعد وہاں سے نکل کر مدینہ پہنچ گئے۔ پھر قریش کی توقعات کے بالکل خلاف آپ کو وہاں ایسا وقار اور اقتدار حاصل ہوا کہ چشم فلک نے اُس کی نظیر نہیں دیکھی۔ اہل مکہ کو طوعاً وکرہاً آپ کی اطاعت میں داخل ہونا پڑا، یہاں تک کہ فتح مکہ کے موقع پر ٹھیک وہی صورت پیدا ہوگئی جو مصر کے پایۂ تخت میں یوسف علیہ السلام کے سامنے اُن کے بھائیوں کی حاضری کے موقع پر پیدا ہوئی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کے لوگوں سے پوچھا: بتاؤ، میں تمھارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟ اُنھوں نے عرض کیا: 'أخ كريم و إبن أخ كريم'، آپ ایک عالی ظرف بھائی اور عالی ظرف بھائی کے بیٹے ہیں۔ اِس پر آپ نے فرمایا: میں تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی: 'لا تثريب عليكم اليوم، إذهبوا فأنتم الطلقاء' جاؤ، تم آزاد ہو، آج تم پر کوئی گرفت نہیں۔

[۴] یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ قرآن کے مخاطبین اِس قصے پر اِس پہلو سے بھی غور کریں کہ اگر آپ وحی الٰہی سے مشرف نہیں ہوئے تو آپ کے لیے یہ کس طرح ممکن ہوا کہ اِس استقصا اور اِس صحت وصداقت کے ساتھ یہ قصہ سنا سکیں؟ آخر اِس قرآن کے نزول سے پہلے بھی آپ کم وبیش چالیس سال اپنی قوم میں گزار چکے تھے۔ آپ کو اِس سرگذشت سے کچھ بھی واقفیت ہوتی تو اِس طرح کی کوئی بات اِس مدت میں بھی کبھی تو آپ کی زبان پر آتی۔ آپ کے مخاطبین جانتے تھے کہ جس وضاحت اور جس یقین واذعان کے ساتھ آپ یہ قصہ سنا رہے ہیں، اُس کے کوئی آثار اِس سے پہلے کبھی آپ کی کسی گفتگو میں نہیں دیکھے گئے۔ چنانچہ قرآن نے توجہ دلائی ہے کہ سننے والے اِس پر بھی غور کریں۔

[۵] یعنی یعقوب علیہ السلام سے۔ حضرت یوسف اُن کے بیٹے، حضرت اسحاق کے پوتے اور حضرت ابراہیم کے پرپوتے تھے۔ بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب کے بارہ بیٹے اُن کی چار بیویوں سے تھے۔ اُن میں سے حضرت یوسف اور اُن کے چھوٹے بھائی بن یمین ایک بیوی سے تھے اور باقی دس دوسری بیویوں سے۔ یہ لوگ فلسطین کے علاقے حبرون کی وادی میں رہتے تھے۔ اِسے اب الخیل کہا جاتا ہے۔ یہاں جو واقعہ بیان کیا جا رہا ہے،

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

رُءْ يَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۵﴾
وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ
وَ عَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ اِنَّ رَبَّكَ

جواب میں اُس کے باپ نے کہا: بیٹا، اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنانا، ایسا نہ ہو کہ وہ تمھارے خلاف کوئی سازش کرنے لگیں[7]۔ اِس میں شبہ نہیں کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ (تمھارا یہ خواب بتا رہا ہے کہ) تمھارا پروردگار تمھیں اِسی طرح برگزیدہ کرے گا[8] اور تمھیں باتوں کی حقیقت تک پہنچنا سکھائے گا[9] اور تم پر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت تمام کرے گا[10]، جس طرح وہ اِس سے پہلے تمھارے

بائیبل کے علما کی تحقیق کے مطابق وہ ۱۸۹۰ قبل مسیح کے قریب زمانے میں کسی وقت پیش آیا تھا۔ حضرت یوسف کی عمر اُس وقت سترہ برس کی تھی۔

۶؎ یوسف علیہ السلام نے یہ خواب جس طرح سنایا ہے، اُس سے اُن کی طبیعت کے اندر جو تواضع تھی، وہ پوری طرح نمایاں ہوگئی ہے۔ اُنھوں نے پہلے صرف اتنی بات کہی کہ میں نے گیارہ ستارے اور سورج اور چاند دیکھے ہیں۔ پھر آگے کی بات سے چونکہ اُن کی بڑائی سامنے آرہی تھی، اِس لیے کسی قدر رک کر جھجکتے ہوئے بیان کیا ہے کہ میں نے دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کررہے ہیں۔ آیت میں فعل 'رَاَيْتُ' کے اعادے نے یہ جھجک پوری طرح ظاہر کردی ہے۔

۷؎ اِس سے معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی پرخاش اُن کے ساتھ واضح تھی۔ اُن کی اعلیٰ صلاحیتوں کو دیکھ کر حضرت یعقوب اُن سے غیر معمولی طور پر محبت کرنے لگے تھے اور یہی چیز اُن کے بھائیوں کے لیے اُن کے ساتھ حسد کا باعث بن گئی تھی۔

۸؎ یعنی نبوت عطا کرے گا۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت یعقوب نے خواب سنتے ہی اندازہ فرمالیا کہ یہ منصب نبوت پر سرفرازی کا اشارہ ہے۔

۹؎ یعنی اِس رویا کی حقیقت بھی تم پر واضح ہو جائے گی اور اِس نوعیت کی دوسری چیزوں کو سمجھنے کا علم بھی عطا ہوگا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...رویا چونکہ علم نبوت کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے اور رویا میں حقائق مجاز کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں جن کو سمجھنا

عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۶﴾

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ﴿۷﴾ اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ
اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ ۨ ﴿۸﴾ اقْتُلُوْا يُوْسُفَ
اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ﴿۹﴾

بزرگوں ابراہیم اور اسحٰق پر کر چکا ہے۔ یقیناً تیرا پروردگار علیم و حکیم ہے۔۳-۶

حقیقت یہ ہے کہ یوسف اور اُس کے بھائیوں (کی اِس سرگذشت) میں پوچھنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں[11]۔ جب اُس کے بھائیوں نے آپس میں کہا کہ یوسف اور اُس کا بھائی[12]، ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ محبوب ہیں، حالاں کہ ہم ایک پورا جتھا ہیں[13]۔ یقیناً ہمارا باپ ایک کھلی ہوئی غلطی میں مبتلا ہے۔ (اِس کا علاج یہی ہے کہ) یوسف کو قتل کر دو یا اُس کو کہیں پھینک دو، تمھارے باپ کی توجہ (اِس سے) صرف تمھاری طرف ہو جائے گی اور اِس کے بعد تم لوگ بالکل ٹھیک ہو

ایک خاص ذہنی مناسبت کا مقتضی ہے، اِس وجہ سے اللہ تعالیٰ حضرات انبیا علیہم السلام کو تعبیر رویا کا ایک خاص ذوق اور ایک خاص علم بھی عطا فرماتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۱۹۲)

۱۰؎ یہ خاص تعبیر ہے جو دین و شریعت کی نعمت کے لیے قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی اختیار کی گئی ہے۔ انسان کی فطرت میں یہ دین بالاجمال ودیعت ہے۔ انبیا علیہم السلام چونکہ اِس کی تمام فروع اور تفصیلات کے ساتھ اِس کو بالکل واضح اور متعین کر دیتے ہیں، اِس لیے قرآن اِسے اتمام نعمت سے تعبیر کرتا ہے۔

۱۱؎ یعنی اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جن کے ذہنوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت سے متعلق اِس طرح کے سوالات پیدا ہو رہے ہیں کہ آگے کیا ہو گا اور کس طرح ہو گا۔ اِس دعوت کے جن شان دار نتائج کی طرف اشارے کیے جا رہے ہیں، وہ کیسے نمودار ہوں گے، جبکہ اِس وقت تو اِس کے علم بردار وقت کے متمردین کے ہاتھوں ہر قسم کے آلام و مصائب کا ہدف بنے ہوئے ہیں اور ہر طرف اُنھی عقائد و افکار کا غلبہ نظر آتا ہے جنھیں یہ لوگ ہدف تنقید بنا رہے ہیں۔

۱۲؎ اِس سے یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی بن یمین مراد ہیں۔ یہ اُن سے کئی سال چھوٹے تھے۔

قَالَ قَآئِلٌ مِّنۡهُمۡ لَا تَقۡتُلُوۡا يُوۡسُفَ وَاَلۡقُوۡهُ فِىۡ غَيٰبَتِ الۡجُبِّ يَلۡتَقِطۡهُ بَعۡضُ السَّيَّارَةِ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِيۡنَ ﴿۱۰﴾

قَالُوۡا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاۡمَنَّا عَلٰى يُوۡسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوۡنَ ﴿۱۱﴾ اَرۡسِلۡهُ مَعَنَا غَدًا يَّرۡتَعۡ وَيَلۡعَبۡ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۱۲﴾ قَالَ اِنِّىۡ لَيَحۡزُنُنِىۡۤ اَنۡ تَذۡهَبُوۡا بِهٖ

جاؤ گے۔[۱۴] (اِس پر) اُن میں سے ایک کہنے والے نے کہا: یوسف کو قتل نہ کرو، اگر کچھ کرنا ہی ہے تو اُس کو کسی اندھے کنویں کی تہ میں پھینک دو، کوئی راہ چلتا قافلہ اُسے نکال لے جائے گا۔[۱۵] ۷-۱۰

(اِس کے بعد وہ گئے اور) اُنھوں نے اپنے باپ سے کہا: ابا جان، کیا بات ہے کہ یوسف کے معاملے میں آپ ہم پر بھروسا نہیں کرتے، دراں حالیکہ ہم اُس کے سچے خیر خواہ ہیں۔ اُسے کل ہمارے ساتھ جانے دیجیے، ذرا کچھ چر چگ لے اور کھیلے کودے،[۱۶] ہم اُس کی حفاظت کے ذمہ دار

www.ar-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

۱۳؎ بدویانہ زندگی میں آدمی کی قوت کا انحصار جوان بیٹوں ہی پر ہوتا تھا۔ وہی دشمنوں کے مقابلے میں اُس کے کام آتے تھے۔ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اِسی کے پیش نظر کہا ہے کہ والد، معاذ اللہ، ایسے ناعاقبت اندیش ہو گئے ہیں کہ بیٹوں کا جو جتھا مشکل وقت میں اُن کے کام آ سکتا تھا، اُسے تو نظر انداز کر رہے ہیں اور اپنی محبت اُن چھوٹے بچوں پر نچھاور کرتے ہیں جو اُن کے کسی کام نہیں آ سکتے، بلکہ خود ہی حفاظت کے محتاج ہیں۔

۱۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'تَكُوۡنُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ قَوۡمًا صٰلِحِيۡنَ'۔ یہ فقرہ سابق جواب امر پر معطوف ہے، اِس لیے اِس کا حکم اُس سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ لفظ 'صَالِح' یہاں نیک کے معنی میں نہیں، بلکہ ٹھیک اپنے لغوی مفہوم میں آیا ہے۔ یعنی اِس کے بعد ہم ایسے لوگ ہوں گے جن کا حال بالکل ٹھیک ہو گا، تمام پریشانیاں دور ہو جائیں گی اور یہ کانٹا جو اِس وقت چبھ رہا ہے، نکل جائے گا۔ ہم نے ترجمے میں یہی مدعا ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱۵؎ یہ مشورہ بتا رہا ہے کہ دس بھائیوں میں سے کسی ایک کے دل میں یوسف علیہ السلام کے لیے نرم گوشہ تھا۔ وہ یہ تو ضرور چاہتا تھا کہ پہلو کا یہ کانٹا نکل جائے، مگر اِس حد تک جانے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اِس کے لیے اُن کی جان لے لے۔

۱۶؎ بدویانہ زندگی میں دل بہلانے کا یہ طریقہ نہایت مقبول رہا ہے کہ بستی سے باہر جا کر دشت و صحرا یا کسی

وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾ قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾ قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ وَمَآ اَنْتَ

ہوں گے۔ باپ نے کہا: مجھے یہ چیز افسردہ کر دیتی ہے کہ تم اُسے لے جاؤ اور ڈرتا ہوں کہ تم اُس سے غافل ہو اور اُسے بھیڑیا کھا جائے[17]۔ اُنھوں نے جواب دیا: اگر اُسے بھیڑیے نے کھا لیا، جبکہ ہم ایک جتھا ہیں تو ہم بڑے ہی نامراد ہوں گے۔ ۱۱-۱۴

اِس طرح (اصرار کر کے) جب وہ یوسف کو لے گئے اور بالآخر طے کر لیا کہ اُس کو کنویں کی تہ میں پھینک دیں[18] اور (اُدھر) ہم نے اُس کو وحی کر دی کہ تم (ایک دن) اِن کی اِس حرکت سے اِنھیں آگاہ کرو گے، جب اِنھیں کچھ خیال بھی نہ ہو گا[19] اور وہ روتے پیٹتے کچھ رات گئے اپنے باپ کے پاس پہنچ گئے[20] تو اُنھوں نے (آ کر) کہا: ابا جان، ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے میں لگ گئے تھے اور یوسف کو ہم نے

نخلستان میں کچھ وقت اِس طرح گزارا جائے کہ سب مل کر کھائیں پکائیں اور کھیلیں کودیں۔ یہ وہی چیز ہے جسے ہمارے ہاں پکنک سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۱۷؎ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ گرد و پیش کے علاقے میں بھیڑیوں کی کثرت تھی اور وہ باہر جانے والوں پر وقتاً فوقتاً حملے کرتے رہتے تھے۔

۱۸؎ یعنی لانے کے بعد اگرچہ پھر کچھ اختلاف ہوا، لیکن بالآخر یہی بات طے ہوئی کہ کنویں میں ڈال دینا ہی بہتر ہے۔ بائیبل اور تالمود کی روایات کے مطابق یہ کنواں سکم کے شمال میں دوتن (موجودہ دثان) کے قریب واقع تھا۔

۱۹؎ یعنی اُس وقت آگاہ کرو گے، جب اِن کے تصور میں بھی نہیں ہو گا کہ جس بھائی کو ہم نے اندھے کنویں میں ڈال دیا تھا، وہ اِس مقام بلند پر فائز ہے اور ہم سے بات کر رہا ہے۔

۲۰؎ رات گئے واپس آنے میں غالباً یہ مصلحت رہی ہو گی کہ باپ اگر کسی کو تلاش کے لیے بھیجنا چاہے تو اِس کا بھی

بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿١٧﴾ وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ قَالَ بَلْ
سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿١٨﴾
وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ وَاَسَرُّوْهُ
بِضَاعَةً وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٩﴾ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ

اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا کہ اتنے میں بھیڑیا (آیا اور) اُس کو کھا گیا[21]۔ آپ تو ہماری بات کا یقین نہ کریں گے، اگرچہ ہم سچے ہوں[22]۔ وہ (اِس بات کو ثابت کرنے کے لیے) یوسف کے قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا کر لے آئے تھے۔ باپ نے کہا: (نہیں)، بلکہ یہ تو تمھارے دل نے تمھارے لیے ایک بات گھڑ لی ہے۔ سو اب صبر جمیل (کی توفیق ملے)[23] اور جو کچھ تم بیان کر رہے ہو، اُس پر خدا ہی سہارا ہے[24]۔ ۱۵-۱۸

(اُدھر) ایک قافلہ آیا اور اُنھوں نے اپنا پانی بھرنے والا بھیجا[25]۔ سو اُس نے اپنا ڈول (کنویں میں) ڈالا، (پھر یوسف کو دیکھ کر) پکار اٹھا: خوش خبری ہو، یہ تو ایک لڑکا ہے۔ (چنانچہ) اُنھوں نے (اُس کو نکالا اور) اُس کو پونجی سمجھ کر چھپا لیا[26] اور جو کچھ وہ کر رہے تھے، اللہ اُس سے خوب واقف تھا۔ (پھر لے

امکان باقی نہ رہے۔

۲۱۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب نے جو کچھ کہا تھا، اُنھوں نے اُسی سے بات بنا لی کہ باپ کے ذہن میں بھیڑیے کا اندیشہ پہلے سے موجود ہے، اِس لیے جلد باور کر لیں گے۔

۲۲۔ یہ دل کا چور ہے جو زبان پر آ گیا ہے۔

۲۳۔ آیت میں 'صَبْرٌ جَمِيْلٌ' کا ترجمہ اچھا صبر ہو سکتا ہے، یعنی وہ صبر جس میں فریاد نہ ہو، گلہ شکوہ نہ ہو، جزع فزع اور نوحہ و ماتم نہ ہو۔ یہ اصل میں مبتدا کے طور پر آیا ہے جس کی خبر محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۲۴۔ مطلب یہ ہے کہ اب یہ عقدہ اُسی کی مدد سے کھل سکتا ہے کہ تم نے کیا کیا ہے اور کیا بات بنا کر لے آئے ہو۔

۲۵۔ اصل میں لفظ 'وَارِد' آیا ہے۔ اِس کے اصل معنی تو کسی گھاٹ یا چشمے پر اترنے والے کے ہیں، لیکن یہاں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وَ کَانُوۡا فِیۡہِ مِنَ الزّٰہِدِیۡنَ ﴿۲۰﴾

وَقَالَ الَّذِی اشۡتَرٰىہُ مِنۡ مِّصۡرَ لِامۡرَاَتِہٖۤ اَکۡرِمِیۡ مَثۡوٰىہُ عَسٰۤی اَنۡ یَّنۡفَعَنَاۤ اَوۡ نَتَّخِذَہٗ وَلَدًا ؕ وَ کَذٰلِکَ مَکَّنَّا لِیُوۡسُفَ فِی الۡاَرۡضِ ۫ وَ لِنُعَلِّمَہٗ مِنۡ تَاۡوِیۡلِ الۡاَحَادِیۡثِ ؕ وَ اللّٰہُ

کر مصر پہنچ گئے) اور اُس کو تھوڑی سی قیمت، چند درہموں کے عوض بیچ دیا اور وہ اُس کے معاملے میں کوئی رغبت نہیں رکھتے تھے۔[27] ۱۹-۲۰

مصر کے لوگوں میں سے جس نے اُسے خریدا،[28] اُس نے اپنی بیوی[29] سے کہا: اِس کو خاطر سے رکھنا، امید ہے کہ ہم کو نفع پہنچائے یا ہم اِسے بیٹا ہی بنا لیں۔[30] اِس طرح یوسف کو ہم نے اُس ملک میں جگہ دی، (اِس لیے کہ اُسے برگزیدہ کریں)[31] اور اِس لیے کہ اُسے باتوں کی حقیقت تک پہنچنا سکھائیں۔[32]

یہ اُس شخص کے لیے استعمال ہوا ہے جو قافلے والوں کی طرف سے پانی کے انتظام کے لیے مقرر کیے جاتے تھے۔ بائیبل اور تالمود، دونوں کی روایت ہے کہ یہ قافلہ جلعاد (شرق اردن) سے مصر جا رہا تھا جس کا دارالسلطنت اُس زمانے میں ممفس تھا جس کے کھنڈر قاہرہ کے جنوب میں ۲۱ کلو میٹر کے فاصلے پر پائے جاتے ہیں۔

۲۶؎ اِس لیے چھپا لیا کہ گرد و پیش سے آ کر کوئی شخص اُس پر اپنا دعویٰ پیش نہ کر دے۔

۲۷؎ اِس لیے بے رغبت تھے کہ جو کچھ ملا تھا، بغیر کسی قیمت کے ملا تھا، لہٰذا جو خریدار بھی سب سے پہلے سامنے آیا اور اُس نے جو کچھ بھی پیش کر دیا، اُسی پر بیچ کر فارغ ہو گئے۔

۲۸؎ بائیبل میں اُس شخص کا نام فوطیفار لکھا ہے۔ یہ شاہی جلو داروں کا کوئی بڑا افسر تھا۔ آگے قرآن نے اِسے 'عزیز' کے لقب سے یاد کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے مصر میں یہ کوئی خاص منصب تھا جو سلطنت کے امرا کو دیا جاتا تھا۔

۲۹؎ اِس کا نام تالمود میں زلیخا (Zelicha) لکھا ہے۔

۳۰؎ اِس سے واضح ہے کہ حضرت یوسف کو دیکھتے ہی اُس نے سمجھ لیا کہ یہ کوئی غلام نہیں ہے، بلکہ شریف خاندان کا لڑکا ہے جو کسی وجہ سے اِن بیچنے والوں کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ مزید یہ کہ اُس وقت تک وہ غالباً بے اولاد تھا، اِس لیے اُس نے سوچا کہ یہ لڑکا اُس کی امیدوں پر پورا اترا تو وہ اِسے متبنیٰ کر لے گا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

غَالِبٌ عَلٰٓى اَمۡرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيۡنٰهُ حُكۡمًا وَّ عِلۡمًا وَكَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۲۲﴾

(حقیقت یہ ہے کہ) اللہ اپنے ارادے کو نافذ کر کے رہتا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ (چنانچہ اِسی طرح ہوا) اور جب وہ پختگی کو پہنچ گیا تو ہم نے اُس کو حکم اور علم عطا فرمایا۔[۳۳] اُن کو جو خوبی والے ہوں، ہم اِسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔ ۲۱-۲۲

۳۱؎ یہ جملہ معللہ کا معطوف علیہ ہے جسے غایت وضاحت کی بنا پر حذف کر دیا ہے۔

۳۲؎ یعنی بدویت سے نکال کر مصر جیسے متمدن اور ترقی یافتہ ملک میں جگہ دی تا کہ باتوں کی تہ تک پہنچ جانے کی جو غیر معمولی صلاحیت اُس کے اندر ودیعت ہے، وہ نمایاں ہو کر مصر کی بادشاہی کے لیے بھی زمین ہموار کر دے اور اُسے ایک متمدن علاقے میں کار نبوت کے لیے بھی پوری طرح تیار کر دے۔

۳۳؎ یعنی وہ علم جو انسان کی رہنمائی کے لیے آسمان سے نازل ہوتا ہے۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

امین احسن اصلاحی
ترتیب و تدوین: خالد مسعود۔سعید احمد

خدا ترسی اور خشیت الٰہی کے بارے میں روایات

(مَا جَاءَ فِی التُّقٰی)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وَحَدَّثَنِیْ مَالِكٌ عَنْ اِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِیْ طَلْحَةَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ وَ خَرَجْتُ مَعَهُ حَتّٰى دَخَلَ حَائِطًا فَسَمِعْتُهُ وَهُوَ يَقُوْلُ وَ بَيْنِيْ وَ بَيْنَهُ جِدَارٌ وَهُوَ فِيْ جَوْفِ الْحَائِطِ: عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ بَخٍ بَخٍ وَاللّٰهِ لَتَتَّقِيَنَّ اللّٰهَ اَوْ لَيُعَذِّبَنَّكَ قَالَ مَالِكٌ: وَبَلَغَنِيْ اَنَّ الْقَاسِمَ بْنَ مُحَمَّدٍ كَانَ يَقُوْلُ: اَدْرَكْتُ النَّاسَ وَمَا يَعْجَبُوْنَ بِالْقَوْلِ. قَالَ مَالِكٌ: يُرِيْدُ بِذٰلِكَ الْعَمَلَ اِنَّمَا يُنْظَرُ اِلٰى عَمَلِهِ، وَلَا يُنْظَرُ اِلٰى قَوْلِهِ.

''حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے سنا۔ میں ان کے ساتھ نکلا تھا یہاں تک کہ وہ ایک باغ میں داخل ہو گئے تو اس حال میں کہ میرے اور ان کے درمیان دیوار حائل تھی اور وہ باغ کے بیچ میں تھے، میں نے سنا وہ کہہ رہے تھے کہ اے عمر بن الخطاب، اے امیر المومنین، کیا کہنے ہیں امیر المومنین کے! اللہ کی قسم، اللہ سے ڈرتے رہو، ورنہ وہ تمھیں بہت

سخت عذاب دے گا۔ امام مالک کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ قاسم بن محمد کہا کرتے تھے کہ میں نے جن لوگوں کو پایا ہے، وہ بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ امام مالک کہتے ہیں کہ اس سے ان کی مراد عمل تھا، یعنی یہ کہ آدمی کے قول کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی، بلکہ اس کے عمل کو اہمیت دی جاتی تھی۔''

وضاحت

'بَخٍ' تحسین کے لیے آتا ہے، لیکن طنز کے موقع پر بھی آ سکتا ہے۔ یعنی کیا کہنے امیر المومنین کے! حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ اپنے آپ سے کہہ رہے تھے۔ یہ خود احتسابی کی بہت اعلیٰ مثال ہے۔ اصل تقویٰ کی علامت یہی ہوتی ہے۔ وہ باغ میں گئے۔ جب علیحدہ ہو کر بیٹھے تب انھوں نے اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہا کہ عمر بن الخطاب امیر المومنین، ماشاء اللہ، بڑا امیر المومنین بنا پھرتا ہے، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو گے تو خیر ہے، ورنہ وہ تمھیں عذاب دے گا کہ تمھارا کچومر نکال کر رکھ دے گا۔ تم بڑے ہی سخت عذاب میں پڑو گے۔

قاسم بن محمد کا قول امام مالک کی بلاغات میں سے ہے۔ ان کی بلاغات شہادت دیتی ہیں کہ وہ جس بات کو اچھا سمجھتے ہیں، اس کو لے لیتے ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ حدیث ہے یا نہیں اور اس کی سند کیا ہے۔ میرے نزدیک ایسا کرنے میں بہت سے خطرات ہیں۔

(تدبر حدیث ۵۲۰-۵۲۱)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

معز امجد
ترجمہ وتدوین: شاہد رضا

تعظیم خداوندی کے تقاضے

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: إِنَّ مِنْ إِجْلَالِ اللّٰہِ إِکْرَامَ ذِی الشَّیْبَۃِ الْمُسْلِمِ وَحَامِلِ الْقُرْآنِ غَیْرِ الْغَالِیْ فِیْہِ وَالْجَافِیْ عَنْہُ وَإِکْرَامَ ذِی السُّلْطَانِ الْمُقْسِطِ.

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک، بوڑھے مسلمان، حافظ قرآن ـــــ جو نہ اس میں غلو کرنے والا ہو اور نہ اس کی نافرمانی کرنے والا ہو ـــــ اور منصف حکمران کی تعظیم کرنا، سب اللہ تعالیٰ کی تعظیم میں سے ہیں۔

وضاحت

یہ روایت ابوداؤد، رقم ۴۸۴۳ میں روایت کی گئی ہے۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ بیہقی، رقم ۱۶۴۳۵؛ ابن ابی شیبہ، رقم ۲۱۹۲۲، ۶۱ ۳۲۵ میں بھی روایت کی گئی ہے۔ تاہم دور حاضر کے مشہور اور قابل احترام عالم حدیث علامہ ناصر الدین البانی نے ثقاہت کے اعتبار سے اس روایت کو صحیح سے کم درجے کی روایت قرار دیا ہے۔ اپنی متعدد کتابوں میں انھوں نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے۔[1]

[1] مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے: صحیح الجامع الصغیر ۱/۴۳۸، رقم ۲۱۸۹؛ صحیح ابوداؤد ۳/۱۸۹، رقم ۴۸۴۳؛ مشکوٰۃ المصابیح

خلاصۂ بحث

اس روایت کی سند کے بارے میں علامہ ناصر الدین البانی کی رائے کے مطابق، ہم احتیاطاً اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل قول قرار نہیں دے سکتے[۲]۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۳/۳۸۸، رقم ۲۷۴۹؛ صحیح الترغیب والترہیب ۱/۱۵۱، رقم ۹۸ اور صحیح الادب المفرد ۱۰۴، رقم ۲۷۴۔

۲؎ یہ صاحب تحریر کی اپنی ذاتی رائے ہے جو کہ درست نہیں ہے، کیونکہ علامہ البانی کے حسن کہنے سے بھی محدثین کے نزدیک یہ، بہرحال، قابل حجت رہتی ہے۔ حدیث حسن کے بارے میں محدثین کا نقطۂ نظر یہ ہے:

''هو كالصحيح في الإحتجاج به، وإن كان دونه في القوة، لذالك إحتج به جميع الفقهاء وعملوا به، وعلى الإحتجاج به معظم المحدثين والأصوليين، إلا من شذ من المتشددين.'' (تیسیر مصطلح الحدیث، محمود الطحان ۴۵)

''حدیث حسن قابل حجت ہونے میں حدیث صحیح ہی کی طرح ہے، اگرچہ وہ اس سے قوت میں کم ہے، کیونکہ تمام فقہا نے اسے قابل حجت مانا ہے اور اس پر عمل کیا ہے، اور سوائے بعض شاذ متشددین کے کبار محدثین اور اصولیین نے بھی اسے قابل حجت مانا ہے۔'' (مدون)

محمد وسیم اختر مفتی

حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت خالد بن سعید کے دادا کا نام عاص بن امیہ تھا۔ان کے پڑدادا امیہ بن عبد شمس قریش کے خاندان بنو امیہ کے بانی تھے،ان کی نسبت سے وہ اموی کہلاتے ہیں۔عبد مناف پران کا شجرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرہ سے جا ملتا ہے۔عبد مناف آپ کے چوتھے، جبکہ حضرت خالد کے پانچویں جد تھے۔حضرت خالد کی والدہ انھی کے نام سے ام خالد کنیت کرتی تھیں۔ان کے نانا حباب بن عبد یا لیل بنو ثقیف (یا بنو خزاعہ) سے تعلق رکھتے تھے۔ابو سعید حضرت خالد کی کنیت تھی۔

حضرت خالد بن سعید ان اصحاب رسول میں سے تھے جنھیں قرآن مجید نے 'السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ'* کی صفت سے متصف کیا ہے۔ابن اسحاق کی بیان کردہ فہرست میں ان کا شمار پینتالیسواں ہے، جبکہ واقدی کا کہنا ہے کہ وہ حضرت ابوبکر کے ایمان لانے کے فوراً بعد، پانچویں نمبر پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔بعثت نبوی کے فوراً بعد حضرت خالد نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک گڑھے کے کنارے کھڑے ہیں جس میں آگ خوب دہک رہی ہے۔گڑھا بہت بڑا اور بہت گہرا ہے۔ان کا باپ انھیں اس گڑھے میں پھینکنے ہی لگا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں پہلوؤں سے پکڑ لیا اور گرنے سے بچا لیا۔وہ گھبرا کر بیدار ہوئے اور کہا: اللہ کی قسم، یہ سچا خواب ہے۔وہ سیدنا ابوبکر سے ملے اور خواب بیان کیا۔انھوں نے کہا: تم سے بھلائی کا ارادہ کیا گیا ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کر لو۔ان کی اتباع کرنے اور دائرۂ اسلام میں داخل ہونے سے تم جہنم کے اس گڑھے میں گرنے سے بچ جاؤ گے جس میں تمھارا باپ

---

* التوبہ ۹: ۱۰۰۔

گرنے والا ہے۔ چنانچہ وہ اجیاد کے مقام پر آپ سے ملے اور پوچھا: یا محمد، (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کیا دعوت دے رہے ہیں؟ فرمایا: میں اس اللہ کی طرف بلاتا ہوں جو یکتا ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں، آگاہ کرتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ تم جن پتھروں اور بتوں کی عبادت کرتے ہو، وہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں، ضرر دے سکتے ہیں نہ نفع پہنچا سکتے ہیں، نہ جان سکتے ہیں کہ کون ان کی پوجا کر رہا ہے اور کون نہیں۔ میں دعوت دیتا ہوں کہ ان کی بندگی چھوڑ دو۔ حضرت خالد نے فی الفور کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں۔ ان کے شہادت حق دینے پر آپ بہت خوش ہوئے۔ کچھ روایات کے مطابق وہ ساتویں یا آٹھویں خوش بخت تھے جو ایمان کی نعمت سے سرفراز ہوئے۔ حضرت خالد کے بھتیجے عبداللہ بن عمرو نے ان کا شمار تیسرا یا چوتھا اور ان کی بیٹی حضرت ام خالد نے پانچواں بتایا۔ حضرت ام خالد نے پہلے چار اہل ایمان کے نام بھی لیے: حضرت علی، حضرت ابوبکر، حضرت زید بن حارثہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص۔ سیدہ خدیجہ کا نام بھی شامل کر لیا جائے تو روایتوں کا تفاوت دور ہو جاتا ہے۔ ابن خلدون نے حضرت خالد سے پہلے ایمان قبول کرنے والوں میں حضرت بلال اور حضرت عمر بن عنبسہ کے نام بھی لیے ہیں۔ انھوں نے حضرت سعد کے اسلام کو حضرت خالد سے موخر مانا ہے۔ قبول اسلام کے وقت حضرت خالد شادی شدہ تھے، ان کی اہلیہ امینہ (یا ہمینہ) بنت خلف نے ان کے ساتھ ہی خلعت ایمان پہنا۔ حضرت خالد کے بھائی حضرت عمرو بن سعید بعد میں ایمان لائے۔

ایمان لانے کے بعد حضرت خالد گھر سے غائب ہو گئے۔ حضرت خالد کے والد ابو احیحہ (سعید) کو پتا چلا تو ان کے مشرک بھائیوں اور اپنے غلام رافع کو ان کی تلاش میں دوڑایا۔ انھیں پکڑ کر باپ کے سامنے لایا گیا تو اس نے خوب ڈانٹ پھٹکار کی، برا بھلا کہا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی کے ساتھ خوب پیٹا۔ چھڑی ان کے سر پر ٹوٹ گئی تو کہا: تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پیرو ہو گیا ہے، حالاں کہ تمھیں معلوم ہے کہ اس نے تمھاری قوم کی مخالفت کی، قوم کے معبودوں کو برا بھلا کہا اور تمھارے گزرے ہوئے آبا و اجداد کی عیب جوئی کی۔ حضرت خالد نے کہا: وہ صادق اور راست باز ہیں۔ واللہ، میں ان کی اطاعت میں آ گیا ہوں۔ باپ کا پارا اور چڑھ گیا، اس نے مزید مار پیٹ کی اور مکرر گالیوں سے نوازا۔ پھر کہا: چلا جا، جہاں چاہتا ہے۔ میں تمھارا دانہ پانی بند کر دوں گا، انھوں نے جواب دیا: اگر تو میری خوراک بند کرے گا تو اللہ مجھے رزق دے دے گا جس سے زندہ رہ لوں گا۔ اس نے اپنے بیٹوں کو تاکید کی کہ تم میں سے کوئی اس سے بات بھی نہ کرے۔ چنانچہ حضرت خالد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلے آئے اور آپ کے ساتھ رہنے لگے۔ اس وقت آپ نے علانیہ دعوت شروع نہ کی تھی۔ حضرت خالد بھی مکہ کے نواح میں تنہا نماز ادا

کرتے۔ وہ اپنے والد کی سختی کے باوجود اسلام چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے تو اس نے انھیں مکہ کے ریگ زار میں بھوکا پیاسا ڈال دیا۔ تین دن کے بعد وہ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے۔

ایک بار حضرت خالد کے والد سعید بن عاص بیمار ہوئے تو کہا: اگر اللہ نے مجھے اس مرض سے شفا دی تو وادی مکہ میں ابن ابی کبشہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے رب کی بندگی نہ کی جا سکے گی۔ حضرت خالد بولے: اللہ انھیں شفا نہ دے۔ چنانچہ سعید نے اسی مرض میں وفات پائی۔

اسلام کی طرف سبقت کرنے والے اہل ایمان پر ایذائیں توڑنے میں قریش حد سے گزر گئے، تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا: اللہ کی زمین میں بکھر جاؤ۔ پوچھا: کہاں جائیں، یا رسول اللہ؟ آپ نے حبشہ کی طرف اشارہ کیا، اور فرمایا: وہاں کے بادشاہ کی سلطنت ظلم و جور سے پاک ہے۔ چنانچہ رجب ۵ نبوی میں حضرت عثمان بن مظعون کی قیادت میں پندرہ اصحاب کا پہلا قافلہ سوے حبشہ روانہ ہوا۔ پھر کئی مسلمانوں نے حبشہ کا رخ کیا۔ حضرت خالد بن سعید اور ان کی اہلیہ حضرت امینہ بنت خلف حضرت جعفر بن ابو طالب کی معیت میں حبشہ گئے۔ حضرت خالد کے بھائی حضرت عمرو بن سعید اور ان کی اہلیہ حضرت فاطمہ بنت صفوان بھی ساتھ تھیں۔ اس قافلے کے سڑسٹھ[1] شرکا کو شامل کر کے مہاجرین کی کل تعداد تراسی[2] ہو گئی۔

عبید اللہ بن جحش اور ان کی اہلیہ حضرت ام حبیبہ (اصل نام: رملہ) بنت ابوسفیان نے بھی حبشہ ہجرت کی۔ حبشہ پہنچ کر عبید اللہ کے اپنے الفاظ میں، ''ان کی آنکھیں کھل گئیں'' اور وہ مرتد ہو کر نصرانی ہو گئے۔ حضرت ام حبیبہ اسلام پر قائم رہیں تو عبید اللہ نے انھیں چھوڑ دیا۔ ۷ھ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کا ارادہ کیا اور حضرت عمرو بن امیہ ضمری کو پیام دے کر حبشہ روانہ فرمایا۔ شاہ حبشہ نجاشی نے اپنی باندی ابرہہ کے ذریعے سے حضرت ام حبیبہ کی مرضی معلوم کی، پھر حضرت جعفر بن ابو طالب اور دیگر مہاجرین حبشہ کو جمع کر کے آپ سے ان کا نکاح پڑھایا۔ آپ کی طرف سے چار سو دینار بطور مہر بھی ادا کیے۔ حضرت ام حبیبہ نے حضرت خالد بن سعید بن عاص کو اپنا وکیل مقرر کیا، انھوں ہی نے دلہن کی طرف سے قبولیت کے کلمات کہے اور مہر کی رقم وصول کی۔ ایک شاذ روایت کے مطابق حضرت عثمان بن عفان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وکیل بنے۔ نجاشی کی ملکاؤں نے حضرت ام حبیبہ کو خوشبو کے تحائف دیے۔ حضرت عمرو بن امیہ کو حبشہ بھیجنے کی دوسری غایت یہ تھی کہ مہاجرین کو مدینہ لایا جائے۔ طبرانی

---

[1] چھیاسی: ابن ہشام، ابن کثیر۔

[2] ایک سو ایک: ابن کثیر، ایک سو آٹھ: ابن جوزی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کی ''معجم کبیر'' (رقم ۱۴۷۸) میں بیان ہوا ہے:

''ہجرت مدینہ کو سات برس بیت گئے تو جعفر اور باقی مہاجرین نے یہ کہہ کر مدینہ جانے کی خواہش ظاہر کی کہ ہمارے نبی غالب آ گئے ہیں اور دشمن مارے جا چکے ہیں۔ چنانچہ نجاشی نے زادراہ اور سواریاں دے کر ان کو رخصت کیا۔''

دو کشتیوں میں پورے آنے والے ان مہاجرین کے نام یہ ہیں: حضرت جعفر بن ابوطالب، ان کی اہلیہ حضرت اسماء بنت عمیس، ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن جعفر، حضرت خالد بن سعید بن عاص، ان کی اہلیہ حضرت امینہ (: ابن اسحاق یا ہمینہ: ابومعشر) بنت خلف، قیام حبشہ کے دوران میں پیدا ہونے والے ان کے بیٹے حضرت سعید بن خالد اور حضرت امہ (کنیت: ام خالد) بنت خالد، حضرت خالد کے بھائی حضرت عمرو بن سعید بن عاص، حضرت معیقیب بن ابو فاطمہ، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت اسود بن نوفل، حضرت جہم بن قیس، ان کے بیٹے حضرت عمرو بن جہم اور حضرت خزیمہ بن جہم، حضرت عامر بن ابووقاص، حضرت عتبہ بن مسعود، حضرت حارث بن خالد، حضرت عثمان بن ربیعہ، حضرت محمیہ بن جز، حضرت معمر بن عبداللہ، حضرت ابوحاطب بن عمرو، حضرت مالک بن ربیعہ، ان کی زوجہ حضرت عمرہ بنت سعدی اور حضرت حارث بن عبدقیس۔ سرزمین حبشہ میں وفات پا جانے والے اہل ایمان کی بیوگان بھی کشتیوں میں سوار تھیں۔ مہاجرین کی دونوں کشتیاں صحیح سلامت حجاز (بولا: ابن سعد) کے ساحل پر پہنچ گئیں۔ پھر وہ اونٹوں پر سوار ہو کر مدینہ پہنچے۔ ان دنوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح خیبر سے فارغ ہوئے تھے، آپ مدینہ لوٹے تو مہاجرین کو خوش آمدید کہا۔ ابن ہشام کے بیان سے لگتا ہے کہ ام المومنین ام حبیبہ بنت ابوسفیان ان کشتیوں کے مسافروں میں شامل نہ تھیں، جبکہ ابن خلدون نے وضاحت کی ہے کہ وہ لوٹنے والے مہاجرین کی ہم سفر تھیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت خالد بن سعید کی بیٹی حضرت ام خالد بیان کرتی ہیں کہ میرے والد چودہ برس حبشہ میں مقیم رہے۔ میں وہیں پیدا ہوئی۔ ۷ھ میں وہ حبشہ سے لوٹے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خیبر میں ملاقات کی۔ آپ نے لوٹنے والے مہاجرین سے گفتگو فرمائی اور خیبر کی غنیمتوں میں سے حصہ دیا۔ ہم آپ ہی کے ساتھ مدینہ واپس آئے۔ میرے والد حضرت خالد عمرۂ قضا کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ گئے۔ انھوں نے اور میرے چچا حضرت عمرو بن سعید نے فتح مکہ اور غزوۂ تبوک میں حصہ لیا۔ حضرت خالد بن سعید حنین اور طائف کی جنگوں میں شریک رہے۔ حضرت خالد کو آپ نے صدقات وزکوٰۃ کی وصولی کے لیے یمن (مذحج) کا عامل (collector) مقرر کیا، آپ کے حکم پر وہ صنعاء کے عامل بھی رہے۔ فیروز دیلمی بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے صنعاء پر عامل مقرر رہے۔

حضرت خالد بن سعید اور حضرت عمرو بن سعید نے حبشہ سے آ کر مکہ میں مقیم اپنے مشرک بھائی ابان بن سعید کو

قبول اسلام کی دعوت دی، چنانچہ وہ مسلمان ہو کر مدینہ چلے آئے۔

حضرت خالد بن سعید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: یارسول اللہ، ہم نے آپ کے ساتھ بدر کے معرکہ میں حصہ نہیں لیا۔ آپ نے جواب فرمایا: خالد، تم پسند نہیں کرتے کہ لوگوں کی ایک ہجرت ہو اور تمھاری دو ہجرتیں۔ حضرت خالد نے کہا: کیوں نہیں؟ آپ نے فرمایا: تمھیں دہرا اجر ہی ملے گا۔ حضرت خالد آپ سے ملنے آئے تو ان کی بیٹی امہ (ام خالد) ان کے ساتھ تھیں۔ انھوں نے بیٹی سے کہا: اپنے چچا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ اور انھیں سلام کرو۔ ام خالد تب چھوٹی تھیں، وہ بیان کرتی ہیں: ''میں اپنے والد کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی تو زرد قمیص پہن رکھی تھی۔ آپ نے فرمایا: 'سنہ، سنہ'۔ حبشہ کی امہری زبان (amharic) کے اس لفظ کا مطلب ہوتا ہے: خوب صورت۔ (میں پیچھے سے آ کر آپ سے لپٹ گئی اور) مہر نبوت سے کھیلنے لگی۔ میرے والد نے ڈانٹا تو آپ نے ارشاد فرمایا: اسے کھیلنے دو، پھر تین بار فرمایا: اس قمیص کو خوب پہنو، خوب استعمال کرو'' (بخاری، رقم ۳۰۷۱)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۹ھ میں بنوعلاج کا عمرو بن امیہ عبد یالیل بن عمرو ثقفی کے پاس آیا اور کہا: تمام عرب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مطیع ہو گیا ہے، اب ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ بنوثقیف نے باہمی مشاورت کے بعد قبول اسلام کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے حلیف قبائل کے نمائندے بھی اس میں شامل تھے۔ ماہ رمضان میں یہ چھ (یا پندرہ) رکنی وفد مدینہ آیا۔ حضرت ابوبکر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ آپ سے ملے۔ آپ نے ان کے ٹھیرنے کے لیے ان کی خواہش کے مطابق مسجد نبوی کے ایک کونے میں خیمہ لگوا دیا۔ ہر روز عشا کے بعد آپ ان کے پاس آ کر بیٹھتے اور بات چیت کرتے۔ بنوثقیف کے لوگ آپ کی بیعت کرنے کے ساتھ ایک معاہدہ تحریر کرنا چاہتے تھے جس میں آپ کی طرف سے عائد کردہ شرائط کے علاوہ بنوثقیف کے لیے پروانۂ امن درج ہو۔ حضرت خالد بن سعید نے بنوثقیف کے خیمے اور آپ کے درمیان بھاگ دوڑ کر مذاکرات مکمل کرائے اور جب معاہدہ طے پا گیا تو انھوں نے اسے تحریر بھی کیا۔ آپ کی طرف سے انھیں کھانا بھیجا جاتا تو وہ پہلے حضرت خالد کو کھلاتے اور پھر خود کھاتے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوثقیف کی اس شرط کو رد کر دیا کہ لات کے صنم کو تین سال تک منہدم نہ کیا جائے۔ انھوں نے اس مدت کو کم کر کے لات کو ایک سال، پھر ایک ماہ تک ثابت و سالم رکھنے کا مطالبہ کیا تو بھی آپ نے قبول نہ فرمایا۔ انھوں نے نماز کی چھوٹ مانگی تو آپ نے سخت تہدید کرتے ہوئے فرمایا: ''اس دین میں کوئی بھلائی نہیں جس میں نماز نہ ہو۔'' بنوثقیف کے مطیع ہو جانے کے بعد

آپ نے حضرت عثمان بن ابوالعاص ثقفی کو ان کا امیر مقرر فرمایا۔ وہ جوان تھے اور اسلام کے احکام سیکھنے سکھانے اور قرآن مجید پڑھنے پڑھانے کے بہت حریص تھے۔

۱۰ھ میں بنومراد کے فروہ بن مسیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آئے اور اسلام قبول کیا۔ آپ نے انھیں بارہ اوقیہ (اونس) سونا، ایک عمدہ نسل کا اونٹ اور عمان کی پوشاک عطا کی اور مراد، زبید اور مذحج قبائل کا عامل مقرر کیا۔ آپ نے صدقات کی وصولی کے لیے حضرت خالد بن سعید بن عاص کو ان کے ساتھ روانہ فرمایا اور انھیں ایک خط دیا جس میں فرض صدقات کی تفصیل درج تھی۔ حضرت خالد کی عمل داری نجران، رمع اور زبید کے درمیانی علاقے پر محیط تھی، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک اسی عہدے پر کام کرتے رہے اور وہیں مقیم رہے۔

۱۱ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرض وفات میں مبتلا ہوئے۔ آپ کی بیماری کی خبر سن کر مسیلمہ کذاب نے یمامہ میں اور اسود عنسی نے یمن میں شورش برپا کر دی۔ اسود اپنی شعبدہ بازی اور سحر بیانی سے لوگوں کی عقل پر پردہ ڈال لیتا تھا۔ حضرت خالد کے ساتھی عمرو بن معدیکرب مرتد ہو کر اس سے مل گئے۔ حضرت خالد انھیں روکنے کے لیے گئے تو ان میں باہم جنگ ہوئی۔ حضرت خالد نے وار کر کے ان کی تلوار کا پرتلا کاٹ دیا جس سے ان کے کاندھے پر بھی چوٹ آئی۔ وہ دوبارہ حملہ کرنا چاہتے تھے کہ عمرو گھوڑے سے کود کر پہاڑ پر چڑھ گئے۔ حضرت خالد نے ان کی صمصامہ نامی تلوار اور گھوڑے پر قبضہ کر لیا۔ آخر کار اسود عنسی نے عمرو بن حزام (یا حرام) اور عامل حضرت خالد بن سعید کو یمن سے نکال باہر کیا اور خود حضرت خالد کے مکان میں براجمان ہو گیا۔ دونوں عامل مدینہ لوٹ آئے تو تمام یمن اسود کے قبضے میں آ گیا۔ عمرو بن معدیکرب بعد میں گرفتار ہو کر سیدنا ابوبکر کے سامنے پیش ہوئے اور ارتداد سے رجوع کر کے پھر داخل اسلام ہوئے۔ حضرت خالد بن سعید کا عمرو کی تلوار اور گھوڑا ضبط کرنا ایسا عمل تھا جسے فقہ اسلامی میں خاص اہمیت دی گئی۔ سقوط ایران کے بعد شاہ خسرو (کسریٰ) کا تاج، زیورات اور پوشاکیں عامۃ المسلمین کے ملاحظے کے لیے مدینہ بھیجے گئے تو اسے حضرت خالد بن سعید کے اس عمل کے مشابہ قرار دیا گیا۔

ایک روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چاندی کی انگوٹھی جس پر محمد رسول اللہ نقش تھا، حضرت خالد بن سعید نے آپ کو دی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ایک ماہ بعد حضرت خالد بن سعید یمن سے مدینہ چلے آئے۔ ان کے بھائی عمرو تیما و خیبر سے اور ابان بحرین سے اپنی ذمہ داریاں چھوڑ کر آ گئے۔ سیدنا ابوبکر نے پوچھا: تم کیوں لوٹ آئے ہو؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ عمال سے بہتر کون عامل ہو سکتا ہے۔ اپنے مناصب پر واپس چلے جاؤ۔ انھوں

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

نے کہا: ہم ابواحیحہ (سعید بن عاص) کی اولاد ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کا عامل نہ بنیں گے۔

حضرت خالد یمن سے آئے تو ریشمی چوغہ پہن رکھا تھا، سیدنا عمر اور سیدنا علی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ حضرت عمر دیکھتے ہی چلائے: اس کا جبہ پھاڑ پھینکو، ریشم پہنے ہوئے ہے، حالاں کہ یہ زمانۂ امن میں ہمارے مردوں کے لیے ممنوع ہے۔ چنانچہ آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں نے جبہ پھاڑ اتارا۔ حضرت ابوبکر کی بیعت ہو چکی تھی، لیکن حضرت خالد نے دو ماہ (دوسری روایت: تین ماہ) تک ان کی بیعت نہ کی۔ وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امارت مجھے دی تھی، پھر اپنی وفات تک معزول نہ فرمایا۔ حضرت خالد بن سعید حضرت علی اور حضرت عثمان سے ملے اور سوال کیا: اے ابوالحسن (علی)، اے بنی عبد مناف (عثمان)، امر خلافت میں کیا تم مغلوب ہو گئے تھے؟ تم کیسے راضی ہو گئے کہ کوئی اور والی خلافت بن کر تم پر حکومت کرنے لگے؟ حضرت علی نے کہا: تم اسے مغلوب ہونا کہتے ہو یا انتخاب خلافت سمجھتے ہو؟ حضرت ابوبکر نے ان کی بات کو اہمیت نہ دی، لیکن حضرت عمر نے برا مانا اور خوب ڈانٹا۔ حضرت خالد بن سعید نے بنو ہاشم سے کہا: تم اونچے درختوں اور خوش ذائقہ پھلوں والے لوگ ہو۔ ہم تمھارے پیرو ہیں۔ چنانچہ جب سب بنو ہاشم نے حضرت ابوبکر کی بیعت کر لی تو وہ بھی آمادہ ہو گئے۔ حضرت خالد حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور پوچھا: کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی بیعت کر لوں؟ انھوں نے جواب دیا: میں چاہتا ہوں کہ آپ اس صلح و سلامتی میں شریک ہو جائیں جس میں باقی اہل اسلام داخل ہو چکے ہیں۔ حضرت خالد نے کہا: آج شام کا وعدہ ہے، میں آپ کی بیعت کر لوں گا۔ شام کے وقت حضرت خالد آئے تو ابوبکر منبر پر بیٹھے اور حضرت خالد نے بیعت کی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۳ھ میں خلیفۂ اول نے شام کی طرف فوج بھیجی تو سب سے پہلے حضرت خالد بن سعید کو سالار مقرر کر کے پرچم عطا کیا۔ وہ پرچم لے کر گھر آ گئے۔ اسی اثنا میں حضرت عمر نے ان سے کہا: آپ نے حضرت خالد بن سعید کو سالار بنا دیا، حالاں کہ وہ (آپ کی خلافت کے بارے میں) کیا کچھ کہہ چکے ہیں۔ حضرت ابوبکر نے اسی وقت ابواروی دوسی کو حضرت خالد کے گھر بھیجا۔ انھوں نے حضرت خالد سے کہا: خلیفۂ رسول اللہ نے حکم دیا ہے کہ ہمارا پرچم واپس کر دیا جائے۔ حضرت خالد نے پرچم لوٹا کر کہا: واللہ، آپ کے سپہ سالار بنانے نے ہمیں خوش کیا نہ آپ کا معزول کرنا برا لگا۔ حضرت ام خالد کہتی ہیں کہ پھر حضرت ابوبکر میرے والد سے معذرت کرنے آئے اور ان سے وعدہ لیا کہ حضرت عمر سے کچھ نہ کہیں گے۔ چنانچہ میرے والد وفات تک حضرت عمر کے لیے دعاے رحمت کرتے رہے۔ حضرت خالد بن سعید کو ہٹانے کے بعد حضرت ابوبکر نے حضرت یزید بن ابوسفیان کو سات ہزار کی فوج کا کمانڈر مقرر کیا اور وہی علم ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

حضرت ابوبکر نے حضرت خالد بن سعید کو معزول کرنے کے بعد پوچھا: کون سا کمانڈر تمھیں زیادہ پسند ہے؟ تو انھوں نے کہا: میرے چچا زاد، حضرت شرحبیل بن حسنہ۔ وہ قرابت داری کے علاوہ مجھے دینی طور پر بھی محبوب ہیں، کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے میرے دینی بھائی رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت خالد نے حضرت شرحبیل کے ساتھ رہنا پسند کیا۔ حضرت ابوبکر نے حضرت شرحبیل بن حسنہ کو نصیحت کی کہ تم پر جب کوئی ایسا معاملہ آن پڑے کہ کسی متقی اور خیر خواہ کی راے کی ضرورت محسوس ہو تو سب سے پہلے حضرت ابوعبیدہ بن جراح اور حضرت معاذ بن جبل سے رجوع کرنا، حضرت خالد بن سعید تیسرے شخص ہونے چاہییں۔ ان لوگوں ہی کے ہاں تم نصیحت و خیر خواہی پاؤ گے۔ ان سے مشورہ کیے بغیر راے قائم نہ کر لینا۔ حضرت خالد بن سعید کا حق پہچاننا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو وہ والی تھے، میں نے بھی انھیں والی بنایا، پھر معزول کر دیا۔ امید ہے، اس سے بھی ان کا دینی طور پر بھلا ہی ہوا ہوگا۔

حضرت ابوبکر حضرت خالد کو پسند کرتے اور ان کی عزت افزائی کرتے تھے۔ جیش اسامہ کے کامیاب لوٹنے کے بعد انھوں نے مرتدین کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے گیارہ فوجیں ترتیب دیں۔ دوسرے صحابہ کے ساتھ حضرت خالد کو بھی ایک فوج کا سالار مقرر کر کے پرچم عطا کیا۔ حضرت عمر نے منع کیا اور کہا: یہ ناکارہ اور کم عقل ہے، اس نے ایسی جھوٹی باتیں کی ہیں جن کا اثر دیر تک رہے گا۔ حضرت ابوبکر نے اب ان کی سخت راے کو اہمیت نہ دی اور حضرت خالد بن سعید کے جیش کو شام کی سرحد پر واقع شمالی حجاز کے مقام تیما کی طرف امدادی دستے کے طور پر بھیج دیا۔ تیما کے نخلستان کی طرف بھیجتے ہوئے ان کو نصیحت کی کہ اپنی جگہ ڈٹے رہنا، اطراف کے لوگوں کو اپنے ساتھ شامل ہونے کی دعوت دینا۔ صرف ان لوگوں کو بھرتی کرنا جو مرتد نہ ہوئے ہوں۔ انھی سے قتال کرنا جو جنگ کریں۔ تیما پہنچ کر آس پاس کے بہت سے لوگ حضرت خالد سے آ ملے۔ رومیوں کو اطلاع ملی تو انھوں نے بھی اپنے زیر اثر عرب قبائل بہرا، کلب، سلیح، تنوخ، لخم، جذام اور غسان سے فوجیں اکٹھی کر لیں۔ حضرت خالد نے حضرت ابوبکر کو صورت حال لکھ بھیجی تو انھوں نے ہدایت کی کہ پیش قدمی کرو، گھبراؤ مت اور اللہ سے مدد طلب کرو۔ حضرت خالد یہ جواب ملتے ہی آگے بڑھے۔ دشمن فوج کے قریب پہنچے تو اس کے سپاہی ایسے خوف زدہ ہوئے کہ میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ جیش اسلامی ان کی سرزمین پر قابض ہو گیا تو وہاں کی اکثریت حلقۂ بگوش اسلام ہو گئی۔

حضرت خالد نے فتح کی خبر خلیفۂ اول کو بھیجی تو انھوں نے مزید پیش قدمی کی ہدایت کرتے ہوئے کہا کہ اتنا آگے نہ بڑھ جانا کہ پیچھے سے حملہ ہو جائے۔ حضرت خالد پیش قدمی کر کے اس مقام پر فروکش ہوئے جو آبل، زیزا اور تسطل

کے مابین واقع ہے۔ باہان (یا ماہاب) نامی رومی پادری ان کے مقابلے پر آیا۔ حضرت خالد نے اس کی فوج کو تہ تیغ کر دیا۔ اسے شکست دینے کے بعد مدینہ سے کمک طلب کی۔ چنانچہ سب سے پہلے ولید بن عقبہ ان کی مدد کو پہنچے۔ اس وقت یمن اور اس کے اطراف کے رضا کار مدینہ آئے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ تہامہ، عمان، بحرین اور سرو کے لوگ مختلف معرکوں میں کامیاب ہو کر وہاں پہنچے تھے۔ خلیفۂ اول نے ہدایت جاری کی کہ ان میں سے جو فوجی تبدیلی کے خواہاں ہیں، ان کو تبدیل کر دیا جائے۔ چنانچہ اکثر سپاہی رخصت ہو گئے اور نئے تازہ دم لوگوں نے ان کی جگہ لے لی۔ اس نئی فوج کا نام ''جیش بدال'' پڑ گیا۔ حضرت عکرمہ بن ابوجہل حضر موت کی بغاوت سے فارغ ہو کر مدینہ پہنچے تھے، حضرت ابوبکر نے اس جیش کی قیادت انھیں سونپ کر حضرت خالد بن سعید کی طرف روانہ کر دیا۔ ابھی اور دستے آنے والے تھے، لیکن حضرت خالد بن سعید دو بار فتح حاصل کرنے کے بعد حد سے زیادہ پر اعتماد ہو چکے تھے۔ انھوں نے اس طمع میں کہ جنگ کی کامیابی کا سہرا ان کے سر بندھے، مزید کمک کا انتظار کیے بغیر رومی فوج پر حملہ کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ حضرت ذوالکلاع حمیری، حضرت عکرمہ بن ابوجہل اور حضرت ولید بن عقبہ ان کے ساتھ تھے۔ حضرت خالد آگے بڑھتے گئے، حتیٰ کہ شام کے علاقے مرج الصفر تک پہنچ گئے۔ فوج کی پشت خالی ہونے سے رومیوں کو بدلہ لینے کا موقع مل گیا۔ رومی سپہ سالار باہان تجربہ کار جنگجو تھا، اپنی فوج لے کر دمشق کو چل پڑا، حضرت خالد نے ایلیا تک اس کا پیچھا کیا۔ انھیں خبر بھی نہ ہوئی کہ مرج الصفر کے مقام پر وہ پلٹا اور اسلامی فوج کا محاصرہ کر کے اس کا پشت کا راستہ کاٹ دیا۔ اس طرح ایک دستہ حضرت خالد سے الگ ہو گیا۔ باہان نے حملہ کر کے سب افراد کو شہید کر دیا۔ حضرت خالد کا بیٹا سعید بھی ان میں شامل تھا۔ بیٹے کی شہادت کی خبر سنی تو حضرت خالد نے ہمت ہار دی۔ حضرت عکرمہ کو قیادت سپرد کرتے ہوئے وہ اور حضرت ولید سواروں کا ایک دستہ لے کر ایسے فرار ہوئے کہ مدینے کے قریب ذوالمروہ پہنچ کر دم لیا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت خالد کے بیٹے سعید پانی تلاش کر رہے تھے یا بارش سے بچ کر کہیں بیٹھے تھے۔ اس موقع پر حضرت عکرمہ بن ابوجہل نے فوج کا دفاع کیا اور باہان (یا ماہان) کو مار بھگایا۔ حضرت ابوبکر بہت ناراض ہوئے، انھوں نے حضرت خالد کو خط لکھا کہ تمھیں آگے بڑھنے کا شوق تو ہے، لیکن پھر بزدلی سے جان بچا کر بھاگ آتے ہو۔ انھوں نے ان کو ذوالمروہ ہی میں پڑے رہنے کا حکم دیا اور مدینہ آنے سے روک دیا، البتہ ان کے ساتھ آئے ہوئے فوجیوں کو حضرت شرحبیل بن حسنہ اور حضرت معاویہ بن ابوسفیان کی قیادت میں واپس بھیج دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد انھیں مدینہ آنے کی اجازت ملی تو انھوں نے حضرت ابوبکر سے معافی مانگی۔ حضرت ابوبکر نے کہا: اگر میں حضرت عمر اور حضرت علی کا کہنا مانتا تو حضرت خالد بن سعید سے بچ کر رہتا۔ دوسری روایت کے مطابق حضرت خالد

حضرت ابوبکر کی زندگی میں مدینہ نہ آ سکے۔ان کی وفات کے بعد حضرت عمر خلیفہ بنے تو حضرت خالد بن سعید اور حضرت عقبہ بن ولید سے راضی ہو گئے اور انھیں مدینہ آنے کی اجازت دے دی۔حضرت ابوبکر نے جنگ سے فرار ہونے کی پاداش میں انھیں شام کی طرف لوٹا کر کہا تھا کہ اب میں تمھیں اچھی طرح آزمانا چاہتا ہوں۔جاؤ، جس امیر کے ساتھ چاہتے ہو، مل جاؤ۔ چنانچہ یہ دونوں فوج میں شامل ہو گئے اور سخت معرکوں میں بڑے کارہاے نمایاں انجام دیے۔

حضرت خالد بن سعید کے ساتھ میدان جنگ سے بھاگے ہوئے تین ہزار فوجی بعد میں جنگ یرموک میں شریک ہوئے۔سیف بن عمر کی روایت کے مطابق جسے طبری اور ابن کثیر نے اختیار کیا ہے، یہ جنگ فتح دمشق سے پہلے ۱۳ھ میں لڑی گئی۔طبری کا کہنا ہے کہ حضرت خالد بن سعید خود بھی اس عظیم معرکہ میں شریک تھے۔انھوں نے حضرت خالد بن ولید کے بنائے ہوئے ہزار ہزار سپاہیوں پر مشتمل چالیس (یا چھتیس) دستوں میں سے ایک کی قیادت کی۔اس معرکہ میں وہ شدید زخمی ہوئے اور پھر صحت یاب ہو گئے۔

ایک معرکے میں حضرت خالد بن سعید نے ایک مشرک کو جہنم واصل کیا تو اس کے ریشمی کپڑے خود پہن لیے۔وہ حضرت عمرو بن عاص کے ساتھ پھر رہے تھے اور لوگ ان کو حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔حضرت عمرو نے کہا: کیا دیکھ رہے ہو؟ جس کا دل چاہتا ہے، حضرت خالد جیسا کارنامہ کرے، پھر حضرت خالد کی طرح کا لباس پہن لے۔

ایک روایت کے مطابق حضرت خالد بن سعید مرج الصفر میں رومیوں کے ہاتھوں شہید ہوئے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ مرج الصفر کے شہید حضرت خالد بن سعید نہیں، بلکہ ان کے بیٹے حضرت سعید بن خالد تھے۔ان کی شہادت جنگ اجنادین میں ہوئی جو ۲۸ر جمادی الاولیٰ ۱۳ھ (۳۰ر جولائی ۶۳۴ء) کو رملہ اور بیت جبرین کے قریب واقع مقام اجنادین پر حضرت ابوعبیدہ بن جراح یا حضرت عمرو بن عاص کی کمان میں رومی بازنطینی فوج سے لڑی گئی۔حضرت خالد بن سعید اس میں شریک تھے۔ان کے علاوہ ان کے بھائیوں — حضرت عمرو بن سعید اور حضرت ابان بن سعید — نے بھی اسی معرکہ میں جام شہادت نوش کیا۔

حارث بن ہشام کی بیٹی ام حکیم حضرت عکرمہ بن ابوجہل کے عقد میں تھیں۔حضرت عکرمہ جنگ یرموک (ایک روایت: ۱۳ھ، دوسری روایت: ۱۵ھ) میں شہید ہوئے۔حضرت یزید بن ابوسفیان نے عدت پوری ہونے کے بعد ام حکیم کو زواج کا پیغام بھیجا، لیکن حضرت خالد بن سعید دوران عدت ہی میں انھیں پیام نکاح دے چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے چار سو دینار مہر کے عوض حضرت خالد کے نکاح میں آنا منظور کیا۔فوج آگے بڑھ کر مرج الصفر کے مقام پر پہنچی تو حضرت خالد نے ولیمہ کرنا چاہا۔حضرت ام حکیم نے کہا: کچھ تاخیر کر لیں، حتیٰ کہ اللہ ان فوجوں کو منتشر کر دے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت خالد نے کہا: میرا دل کہتا ہے کہ میں دشمن فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا جاؤں گا۔ام حکیم مان گئیں تو حضرت خالد نے صفر کے مقام پر اس پل کے قریب شب زفاف منائی جسے بعد میں ام حکیم کا پل کہا جانے لگا۔اگلی صبح انھوں نے دوستوں اور ساتھیوں کو ولیمہ کھلایا۔ ولیمے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ رومی فوج نے لڑائی کے لیے اپنی صفیں باندھ لیں۔ایک رومی فوجی تمغے لگا کر مبارزت کے لیے نکلا۔حضرت ابوجندل بن سہیل اس کی طرف بڑھے، لیکن حضرت ابوعبیدہ نے منع کر دیا۔پھر حضرت حبیب بن مسلمہ آئے اور اسے جہنم کے گھاٹ اتار کر واپس ہوئے۔ اب حضرت خالد بن سعید نے مبارزت کی اور کچھ دیر دوبدو جنگ کرنے کے بعد شہید ہو گئے۔دونوں فوجوں میں شدید لڑائی شروع ہوئی تو حضرت ام حکیم نے کپڑے سمیٹے اور زرہ لے کر جنگ میں شامل ہو گئیں۔انھوں نے اس خیمے کی لکڑی اکھاڑی جس میں حضرت خالد بن سعید کے ساتھ ان کی سہاگ رات گزری تھی اور اس کے وار کر کے سات رومیوں کو جہنم رسید کیا۔اس جنگ میں مسلمانوں نے فتح حاصل کی۔حضرت خالد بن سعید کے قاتل کا نام اسلم تھا۔اس کا کہنا ہے کہ میں نے انھیں شہید کیا تو دیکھا کہ نور کا ایک منارآسمان کی طرف بلند ہو رہا ہے۔

حضرت خالد بن سعید وجیہہ اور خوب صورت تھے۔ان کی اہلیہ امینہ (یا ہمینہ) بنت خلف کا تعلق بنوخزاعہ (یا بنوثقیف) سے تھا۔قیام حبشہ کے دوران میں ان کے ہاں سعید اور امۃ کی ولادت ہوئی۔سعید بے اولاد رہے۔امۃ بنت خالد کا بیاہ حضرت زبیر بن عوام سے ہوا اور عمرو اور خالد نے جنم لیا۔حضرت زبیر کے بعد ان کا نکاح حضرت سعید بن عاص سے ہوا،انھوں نے نوے برس کی عمر پائی۔ابن سعد کا کہنا ہے کہ اب (ہمارے زمانے میں) حضرت خالد بن سعید کی نسل باقی نہیں رہی۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام رافع (یا ابورافع) کا اصل نام ابراہیم تھا،ابوالبہی ان کی کنیت بتائی جاتی ہے۔ایک روایت کے مطابق وہ آپ کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب کی ملکیت میں تھے،انھوں نے اپنی ملکیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کی اور آپ نے ان کو آزاد کر دیا۔دوسری روایت کے مطابق جو کم مشہور ہے، وہ حضرت خالد کے والد سعید بن عاص کے مملوک تھے،سعید کی وفات کے بعد ان کی ملکیت اس کے بیٹوں کو منتقل ہوئی۔ حضرت خالد کے تین بھائیوں نے اپنے حصے آزاد کر دیے۔ابورافع نے ان مشرک بھائیوں کے ساتھ جنگ بدر میں حصہ لیا، وہ تینوں مارے گئے۔حضرت خالد نے اپنا حصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیا اور آپ نے ابورافع کو آزاد کر دیا۔

حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں کہ رفاعہ قرظی کی بیوی تمیمہ بنت وہب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور عرض کیا: میں رفاعہ کے عقد میں تھی کہ انھوں نے مجھے طلاق بائن (تیسری طلاق) دے دی۔میں نے عبدالرحمٰن بن زبیر

سے بیاہ کرلیا۔اس کا عضوتناسل کپڑے کی جھالر کی طرح نرم ہے۔کیا تو رفاعہ کے پاس واپس جانا چاہتی ہے؟ آپ نے دریافت کیا اور حکم فرمایا: ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا جب تک تو اس (دوسرے شوہر عبدالرحمٰن) کا ذائقہ نہ چکھ لے اور وہ تجھ سے محظوظ نہ ہو لے۔اس موقع پر حضرت ابوبکر آپ کے پاس بیٹھے تھے اور حضرت خالد بن سعید دروازے پر کھڑے آپ کی طرف سے داخلے کی اجازت کے منتظر تھے۔حضرت خالد نے کہا: ابوبکر، کیا آپ نے اس کی بات نہیں سنی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پکار پکار کر کہہ رہی تھی؟ (بخاری، رقم ۲۶۳۹۔ مسلم، رقم ۳۵۱۷)۔حدیث کے دوسرے طریق میں رفاعہ اور حضرت خالد کی گفتگو کی کچھ تفصیل بیان ہوئی ہے۔رفاعہ کی بیوی تمیمہ نے اپنی اوڑھنی کی جھالر پکڑ کر آپ کو دکھائی اور کہا: اس جھالر جیسا۔حضرت خالد بن سعید نے حضرت ابوبکر سے کہا: آپ اسے جھڑکتے کیوں نہیں؟ (کیسی بے شرمی کی باتیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پکار پکار کر رہی ہے (بخاری، رقم ۵۷۹۲)۔

حضرت خالد کو کاتبین وحی میں شمار کیا جاتا ہے۔حضرت ابی بن کعب اور حضرت زید بن ثابت حاضر نہ ہوتے تو حضرت خالد یا موقع پر موجود کوئی کاتب صحابی وحی تحریر کرتے۔حضرت ام خالد بنت خالد کہتی ہیں کہ میرے والد پہلے شخص تھے جنھوں نے 'بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم' تحریر کی۔نبی صلی اللہ علیہ نے حضرت خالد سے یہ مکتوب لکھوایا:

''بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم'۔یہ وہ قطعۂ زمین ہے جو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے راشد بن عبدرب (ربہ) سلمٰی کو عطا کیا۔آپ نے انھیں (مکہ سے تین میل کی مسافت پر واقع) پہاڑوں میں رہاط کے مقام پر دو تیر کی مار جتنا (لمبا: قریباً اڑھائی سو گز) اور ایک تیر کی مار کے برابر (چوڑا: قریباً سوا سو گز) قطعہ عنایت کیا ہے۔جو ان کا حق لینے کی کوشش کرے، اس کا کوئی حق نہ ہوگا۔راشد کا حق ہی درست مانا جائے گا۔''

یہ فرمان حضرت خالد بن سعید نے تحریر کیا۔کہاوت ہے کہ اقتدار دانائی سکھا دیتا ہے۔حضرت خالد بن سعید یمن پر، حضرت ابان بن سعید بحرین پر اور حضرت عمرو بن سعید تیما اور خیبر پر حکمران رہے، اس لیے مشہور ہوگیا کہ شام کے مفتوحہ شہروں میں کوئی ایسا نہ تھا کہ جہاں حضرت سعید بن عاص کے بیٹوں میں سے کسی نے وفات نہ پائی ہو۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، الجامع المسند الصحیح (بخاری)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، تاریخ الاسلام (ذہبی)، سیر اعلام النبلاء (ذہبی)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، کتاب العبر و دیوان المبتداء والخبر (ابن خلدون)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، سیرۃ النبی (شبلی نعمانی)۔

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.com

پروفیسر خورشید عالم

عورت کی دیت

لفظ 'دیت' لغت کی روشنی میں

لفظ 'دیت' 'وَدٰی یَدِیٰ' کا مصدر ہے۔ جیسے 'عِدَۃ'، 'وَعَدَ یَعِدُ' کا مصدر ہے۔ اس کے معنی بہنے کے ہیں۔ اکثر مفعول کی وہی شکل ہوتی ہے جو مصدر کی۔ چنانچہ 'مُوَدّٰی' کو 'دِیّۃ' کہا جاتا ہے۔ 'وَدٰی' کے لغوی معنی ہیں: بہنا۔ چنانچہ پیشاب کے بعد جو پانی انسان سے نکلتا ہے، اسے 'وَدِی' کہا جاتا ہے۔ (وادی اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی بہتا ہو)۔

''تاج العروس'' (۴۰/۱۷۸) میں ہے کہ دیت اس مال کو کہتے ہیں جو مقتول کی جان کے عوض قاتل کی طرف سے مقتول کے ولی کو دیا جاتا ہے۔ وہ خون جو بہتا ہے اور جس کے بدلہ میں جو مال دیا جاتا ہے، اسے دیت کہتے ہیں۔

ابن حزم کے الفاظ میں، لغت میں لفظ 'دیت' کا تعلق نہ تو محدود مقدار سے ہے نہ محدود جنس سے ہے اور نہ محدود مدت سے[1]۔ لفظ 'دیت' قرآن حکیم میں نکرہ استعمال ہوا ہے، جیسا کہ علامہ جاوید احمد غامدی نے کہا ہے کہ اسم نکرہ اپنے معنی کے تعین، لغت، عرف اور سیاق کلام کا محتاج ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن کے مخاطب کے عرف میں جو شے دیت کے نام سے مشہور ہے، وہ مقتول کے ورثا کے سپرد کی جائے گی۔ اسلام نے نہ تو دیت کی کسی خاص مقدار کا ہمیشہ کے لیے تعین کیا ہے اور نہ ہی مرد اور عورت، غلام اور آزاد اور کافر و مومن کی دیتوں میں کسی فرق کی پابندی ہمارے لیے لازم ٹھہرائی ہے۔

لغوی لحاظ سے قتل عمد اور قتل خطا میں جو خون بہتا ہے، اس کے بدلے میں جو مال دیا جاتا ہے وہ دیت کہلاتا ہے۔

---

[1] المحلی ۱۰/۳۸۸۔

اردو میں اس کا ترجمہ خون بہنا اور انگریزی میں blood wit ہے۔ اس سلسلہ میں معاشی نفع و نقصان قطعی طور پر درخور اعتنا نہیں۔ جب دیت کو مرنے والے کی جان کا بدل قرار دیں گے تو مالی نفع ہو یا نقصان، وہ ہر صورت میں ایک ہی رہے گی۔

''مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ'' (۷۰/۱۴) میں ہے کہ لفظ 'قصاص' عدل اور مساوات پر دلالت کرتا ہے۔ جب سب مقتول خون میں مساوی ہیں تو خون ہی کا بدل دیت ہے۔ شیخ ابوزہرہ اپنی کتاب ''الجریمۃ والعقوبۃ فی الفقہ الاسلامی: العقوبۃ'' میں فرماتے ہیں کہ دیت خون کی سزا ہے اور 'الدیة ھی القصاص بالمعنی دون الصورۃ'، یعنی دیت معناً قصاص ہی ہے، اگرچہ لفظ مختلف ہے۔

قرآن کے اکثر و بیشتر مفسرین، مترجمین اور فقہا نے دیت کا ترجمہ خون بہا (blood wit) ہی کیا ہے۔ ڈاکٹر طاہر القادری نے حنفی فقہ کی تین جغادری کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ امام ابوبکر جصاص کی ''احکام القرآن'' (۲/۲۳۷) میں ہے: 'الدّیة قیمة النفس'، یعنی دیت جان کی قیمت ہے۔ امام سرخسی ''المبسوط'' (۶۳/۲۷) میں فرماتے ہیں کہ دیت جان کی حرمت کی حفاظت کی خاطر خون کے بدلے کا نام ہے۔ امام کاسانی ''البدائع الصنائع'' (۷/۲۵۷) میں فرماتے ہیں: 'الدیة ضمان الدم' (دیت خون کی ضمانت ہے)، یعنی اگر کوئی کسی کا خون بہا دے تو جرمانے (غرام مغرمۃ) کی صورت میں جو مال ادا کیا جائے، وہ دیت کہلائے گا۔

دیت کا مقصد یہ ہے کہ جان کی حرمت برقرار رہے اور کوئی غلطی سے بھی یہ کام نہ کرنے پائے اور وارثوں کی دل جوئی ہو۔ جیسا کہ شاعر کا مصرع ہے:

نأسو بأموالنا آثار أیدینا

''ہم اپنے ہاتھوں کے کیے پر اپنے مال سے دل جوئی کرتے ہیں۔''

دیت زمانۂ جاہلیت میں

دیت اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھی۔ بعض قبائل اپنے شرف کی بنیاد پر دہری دیت لینے اور محض فضل و عنایت کے طور پر دہری دیت دینے کے عادی تھے۔ ''المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام'' (۵/۵۹۲) کے مطابق لونڈی کے بیٹے کی دیت آزاد سے آدھی اور عورت کی دیت مرد کی دیت سے آدھی ہوتی تھی۔ ان کے یہاں مولیٰ، یعنی حلیف کی دیت پانچ اونٹ اور صریح، یعنی جس کا نسبی تعلق کسی قبیلے کے ساتھ قطعی ہو، دس اونٹ تھی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عبدالمطلب نے قرعہ اندازی کی وجہ سے عبداللہ کی دیت ۱۰۰ اونٹ مقرر کی۔ چنانچہ قریش اورعرب میں دیت سو اونٹ رواج پا گئی۔ نبی کریم نے اسی دیت کو برقرار رکھا۔

زمانۂ جاہلیت میں مرد اور عورت کی دیت میں مالی منفعت کے پیش نظر فرق روا رکھا گیا۔ ان کا فلسفہ یہ تھا کہ چونکہ عورت کمائی، یعنی لوٹ مار میں شریک نہیں ہوتی، اس لیے اس کی دیت بھی آدھی ہونی چاہیے۔ اسی فلسفہ کے تحت عورت کو وراثت سے بھی محروم رکھا جاتا تھا۔ اسلام نے دیت کو جان کا بدلہ قرار دیا۔ جس طرح قصاص میں عورت اور مرد کی جان میں کوئی فرق نہیں، اسی طرح خون بہا (دیت) میں بھی فرق نہیں۔ اسلام کے پیش نظر انسانی پہلو ہے، نہ کہ مالی پہلو۔

''مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ'' (۷۹/۱۴) میں ہے:

''پس ایک کی دیت دوسرے کی دیت جیسی مقرر کی گئی، کیونکہ ایک کا خون دوسرے کے مانند ہے، جس کی وجہ سے خون اور دیتوں میں ضمنی طور پر مساوات کے معنی نکلتے ہیں اور یہ مساوات اس قصاص کا تقاضا ہے جو لوگوں کو اس زندگی کا پیغام دیتا ہے جو مہلک فتنوں سے بچاتی ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دیت قرآن کی روشنی میں

سورۂ بقرہ میں اللہ کا ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ. (۲:۱۷۸)

''اے ایمان والو، جو لوگ قتل کر دیے جائیں، ان کے بارے میں تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے۔ اگر آزاد آدمی نے آزاد آدمی کو قتل کیا ہے تو اس کے بدلہ میں وہی قتل کیا جائے گا۔ اگر غلام قاتل ہے تو غلام ہی قتل کیا جائے گا۔ عورت نے قتل کیا ہے تو عورت ہی قتل کی جائے گی اور پھر اگر ایسا ہو کہ قاتل کو مقتول کے وارث سے کہ (رشتہ انسانی میں) اس کا بھائی ہے، معافی مل جائے تو (مقتول کے) وارث کے لیے دستور کے مطابق (خون بہا کا) مطالبہ ہے اور (قاتل کے لیے) خوش معاملگی کے ساتھ ادا کرنا ہے۔''

یہاں ایک ایسے معاملے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جس میں ایک بری رسم کی بیخ کنی مقصود ہے۔ عرب میں رواج

تھا کہ بعض قبائل اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب ان کا غلام قتل ہو جاتا تو وہ کہتے کہ ہم اس کی جگہ آزاد کو قتل کریں گے۔ ایسے ہی اگر آزاد غلام کو قتل کر دیتا تو اس آزاد کو قتل نہ کیا جاتا تھا۔ جب اسلام نے قصاص کا حکم دیا تو سب امتیازات کو مٹا دیا اور فرمایا کہ قاتل آزاد ہو تو وہی قتل کیا جائے۔ غلام قاتل ہو تو وہی قتل کیا جائے۔ عورت قاتل ہے تو وہی قتل کی جائے۔ قاتل خواہ کوئی ہو، یہ عذر پیش نہیں کر سکتا کہ اس کا خون مقتول سے زیادہ قیمتی ہے:

خون شہ رنگین تر از مزدور نیست

قرآن حکیم کا مسلک ہے: 'اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ'[۲] (جان کے بدلے جان)۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

''قصاص کے حکم میں انسانی مساوات کا اعلان اور نسل و شرف کے تمام امتیازات سے انکار ہے جن کی وجہ سے انسانی حقوق پامال ہو رہے ہیں۔ آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، بڑا ہو یا چھوٹا، وضیع ہو یا شریف، انسان ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔ اس لیے قصاص میں کوئی امتیاز تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔''

''معانی القرآن'' (۴۱/۲) میں معروف لغوی یحییٰ الفرّاء (م ۲۰۷ھ) فرماتے ہیں:

''قصاص کا مقصد جان کا بچاؤ ہے۔ اس میں آزاد اور غلام دونوں برابر ہیں۔ جانوں کے بارے میں ایک دوسرے پر فضیلت غیر معتبر ہے دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر ایک جماعت کسی ایک شخص کو قتل کر دے تو اس کے بدلہ میں ان سب کو قتل کیا جائے گا، کیونکہ اللہ کا قول ہے: 'اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ' (جان کے بدلے جان)۔''

اس آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر کوئی مرد آزاد قتل کیا گیا ہے تو اس کے بدلے کسی مرد آزاد کو قتل کیا جائے خواہ قاتل غلام ہو اور اگر مقتول غلام ہے تو کسی غلام کو قتل کیا جائے خواہ قاتل مرد آزاد ہی کیوں نہ ہو۔ قرآن کریم عام اصول مساوات پر زور دیتا ہے اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی خیال نہیں رکھتا۔

امام ابن حزم ''المحلی'' (۳۵۰/۱۰) میں آیت: 'اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ' کے تحت فرماتے ہیں:

''مسلمان کو ذمّی کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ ذمّی اگر چہ کافر ہے اگر وہ ناحق قتل ہوا تو مظلوم ہے 'ومن قتل له قتيل فهو بخير النظرين: إما يؤدى و إما يقاد' (جس کا کوئی آدمی قتل ہو جائے تو اسے دو چیزوں کا اختیار ہے یا وہ دیت لے لے یا انتقام)۔ اس حدیث میں لفظ 'مَن' مطلق ہے جس میں مومن اور کافر، مرد اور عورت چھوٹے اور بڑے سب شامل ہیں۔''

''المحلّی'' (۳۵۲/۱۰-۳۵۳) میں وہ فرماتے ہیں:

۲۔ المائدہ ۵: ۴۵۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

''احناف کی رسوا کن راے ہے کہ وہ کافر کے ہاتھ کے بدلے مسلمان کے ہاتھ کو کاٹنے کا حکم تو دیتے ہیں اور مسلمان آزاد عورت کے ہاتھ کے بدلے مسلمان کا ہاتھ کاٹنے سے روکتے ہیں، حالاں کہ اللہ کا قول ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ[۳] (مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں)، سب کے سب، فاسق بھی، صالح بھی، آزاد بھی اور غلام بھی۔''

آیت مذکور میں سب سے خوب صورت تبصرہ امام ابن تیمیہ نے کیا ہے۔ ''مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ'' (۱۴/ ۷۳) میں ہے:

''کسی قبیلے کے پاس اگر افراد کی کثرت ہوتی اور ساز و سامان بھی ہوتا اور اس کے ایک غلام کو کسی قبیلے کا غلام قتل کر دیتا تو وہ اس کے بدلے دوسرے قبیلے کے آزاد مرد کو قتل کرنے پر زور دیتے اور اگر ان کے قبیلے کی کسی عورت کو دوسرے قبیلے کی عورت قتل کر دیتی تو وہ اس کے بدلے ان کے مرد کو قتل کرنے پر زور دیتے۔ تو اس پر اس آیت کا نزول ہوا۔''

اگلے صفحہ ۷۴ پر وہ فرماتے ہیں:

''مقتول کا قصاص عصبیت اور جہالت کی بنیاد پر دو باہم دست و گریبان قبیلوں کے درمیان واقع ہوتا۔ اور ان دونوں کے درمیان آزادوں، غلاموں اور عورتوں کا قتل ہوتا۔ چنانچہ اللہ نے دونوں قبیلوں کے درمیان عدل کا حکم دیا، وہ اس طرح کہ آزاد کے بدلے آزاد اور عورت کے بدلے عورت کی دیت ادا کی جائے۔ ایک دستور کے مطابق مطالبہ کرے اور دوسرا خوش معاملگی سے اسے ادا کرے۔ یہی اس آیت کا مدلول اور تقاضا ہے...۔''

وہ صفحہ ۷۹ پر فرماتے ہیں:

''اللہ نے ایک کی دیت دوسرے کے برابر اور ایک کا خون دوسرے کے برابر قرار دے کر ضمنی طور پر خون اور دیت میں مساوات کا حکم دیا ہے اور یہی مساوات ان کے لیے حیات نو کا سندیسہ ہے۔''

جب خون برابر ہے تو دیت بھی برابر ہے، کیونکہ یہ خون کا بدلہ ہے۔ قتل میں قصاص اور قصاص میں مساوات تمدن کی ضروریات میں سے ہے۔ سورۂ نساء میں اللہ کا ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَئًا
وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَئًا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ
وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا
فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ

''کسی مومن کو سزاوار نہیں کہ کسی مسلمان کو قتل کر ڈالے، مگر یہ کہ غلطی سے اور جس کسی نے ایک مومن کو غلطی سے قتل کر دیا ہو تو ایک مومن غلام آزاد کرے اور خون بہا ادا کرے جو اس کے وارثوں کے سپرد کیا جائے،

---

۳ الحجرات ۴۹: ۱۰۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

فَتَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ وَاِنۡ كَانَ مِنۡ قَوۡمٍ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهُمۡ مِّيۡثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهۡلِهٖ وَتَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ. (۴:۹۲)

سوائے اس کے کہ وہ معاف کر دیں۔ اگر مقتول ایسے لوگوں میں سے ہو جو تمھارے دشمن ہیں اور وہ مومن ہو تو ایک مومن غلام آزاد کرنا چاہیے اور اگر مقتول ایسے لوگوں میں سے ہو کہ تم میں اور ان میں معاہدۂ صلح ہے تو خون بہا دینا چاہیے جو اس کے وارثوں کے سپرد کیا جائے اور ایک مومن غلام آزاد کرنا چاہیے۔''

یعنی مومن تو مومن کو قتل ہی نہیں کر سکتا، ہاں غلطی سے بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک قوم مسلمانوں کے ساتھ برسر پیکار تھی، مگر ان میں سے ایک شخص مسلمان ہو گیا۔ مسلمانوں نے اسے مسلمان نہیں سمجھا یا کسی اور کو مارنے کا ارادہ تھا، مگر غلطی سے اسے مار دیا گیا۔ اسے خون بہا اس لیے دینا ضروری نہیں کہ اس کے ساتھیوں اور وارثوں سے مسلمانوں کی جنگ ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ قتل خطا کی سزا موت نہیں، صرف دیت کی ادائیگی ہے۔ مقتول کے وارث خون بہا کا تعین نہیں کریں گے، بلکہ عدالت کرے گی۔ یہ آیۂ کریمہ ہر مومن انسان، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، کے قتل کے بارے میں عام ہے اور قاتل کے لیے حرف 'مَنۡ' عام ہے جس میں مرد اور عورت، دونوں شامل ہیں۔ امام رازی ''تفسیر کبیر'' (۱۰/ ۲۳۳) میں لکھتے ہیں کہ ابوبکر الاصم اس آیت کو دلیل بنا کر کہتے ہیں کہ عورت اور مرد کی دیت برابر ہے، کیونکہ اس بات پر اجماع ہے کہ اس آیت کے حکم میں مرد اور عورت، دونوں شریک ہیں قتل خطا کے حکم میں بھی اور 'دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهۡلِهٖ' کے حکم میں بھی۔

علامہ رشید رضا ''تفسیر المنار'' (۴/ ۳۳۳) میں لکھتے ہیں کہ ''ظاہر آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں۔'' علامہ یوسف القرضاوی ''دیۃ المرأۃ فی الشریعۃ الإسلامیۃ'' میں لکھتے ہیں: ''رہی بات سورۂ نساء کی آیت ۹۲ کے معانی کی یہ آیت ہر مومن کے قتل کے بارے میں عام آیت ہے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ اسی طرح وہ حدیث 'إن فی النفس مأۃ من الإبل' بھی عام ہے۔ شریعت قتل کی سزا کے بارے میں نفس انسانی اور اس پر اعتدا کو دیکھتی ہے، خواہ عمداً ہو یا خطاً اور ان دوسرے اعتبارات کو درخور اعتنا نہیں سمجھتی جو لوگوں کے درمیان فرق ملحوظ رکھتے ہیں اور اسی طرح عورت کے قاتل سے قصاص اور مرد کے قاتل کے قصاص میں کوئی فرق نہیں۔ دیت کے بارے میں جو عورت کی وراثت اور شہادت پر قیاس کیا جاتا ہے، وہ قطعی غلط قیاس ہے۔ دیت میں انسانی پہلو غالب ہوتا ہے نہ کہ منفعت کا پہلو۔ دیت کی رقم کا تعین اور اس کا لین دین حکومت کی معرفت ہو گا۔ ورثا کو ازخود معاف کرنے کا اختیار نہیں، کیونکہ ورثا اس کے ترکہ کے وارث ہوتے ہیں، نہ کہ اس کی جان کے۔ ڈاکٹر طاہر القادری نے اس سلسلہ

میں ایک عمدہ نکتہ بیان کیا ہے کہ ''قرآن میں قصاص کی بات کی گئی ہے تو جمع مذکر کی ضمیر 'لکمْ' کی بات کی گئی ہے اور دیت کی بات کی گئی ہے تو مومن کی بات کی گئی ہے اور اگر عورت لفظ 'مومن' سے خارج ہے تو سرے سے بحث ہی ختم ہو گئی۔ وہ دیت سے خارج ہے، کیونکہ وہ قصاص سے خارج ہے اور اگر وہ 'لکمْ' کی ضمیر میں داخل نہیں تو قصاص کا حکم صرف مردوں کے لیے ہوگا اور اگر عورت قتل ہو تو اس پر نہ قصاص ہوگا اور نہ دیت۔ قرآن حکیم میں حکم ہے: 'اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ'، یعنی جان کے بدلے جان ہے۔ آیۂ مبارکہ سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ عورت کے نفس کے بدلے مرد کا نفس قتل کیا جائے اور مرد کے نفس کے بدلے عورت کا نفس قتل کیا جائے۔ چنانچہ قرآن کی رو سے قصاص بدنی بھی ہے اور مالی بھی۔ قرآن نے جس طرح بدنی قصاص میں شریف اور رذیل، مرد و عورت کے درمیان جاہلانہ امتیازات کو مٹا کر مساوات قائم کی ہے، بالکل اسی طرح اس نے مالی قصاص میں عورت اور مرد کے درمیان جاہلانہ امتیازات کو مٹا کر مساوات قائم کی ہے۔ ڈاکٹر طاہر القادری نے جصّاص کی ''احکام القرآن'' (۲/ ۳۴) کے حوالہ سے کہا ہے کہ جب 'دیة' کا لفظ مطلق لکھا ہوا ہو تو اس سے مراد ۱۰۰ اونٹ ہوں گے۔ اس سے کبھی بھی کم تصور نہیں کیے جائیں گے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ عربی اور اردو کی اکثر و بیش تر تفاسیر جو میری نظر سے گزری ہیں، ان میں سے کسی نے عورت کی دیت کا ذکر تک نہیں کیا۔ امام طبری نے ''جامع البیان'' (۴/ ۲۰۹) میں یہ تو کہا ہے کہ ذمی اور مسلمان کی دیت برابر ہے، کیونکہ اس بات پر اجماع ہے کہ ان کے کافر غلاموں اور مومنوں کے غلاموں کی دیت ایک جیسی ہے۔ اسی طرح ان کے آزاد مردوں کی دیت کا بھی حکم ہے، مگر عورت کی دیت کا قطعی کوئی ذکر نہیں کیا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

دیت حدیث کی روشنی میں

سب سے پہلے صحاح ستہ کی صحیح احادیث پیش کی جائیں گی:

۱۔ 'أن فی النفس الدیة مائة من الإبل'، ''جو نفس قتل ہو جائے اس کی دیت سو اونٹ ہے'' (نسائی، رقم ۴۸۵۳۔ سنن دارمی، رقم ۲۳۶۵۔ موطا، رقم ۱۵۴۷)۔

لفظ 'نفس' میں عورت بھی داخل ہے، جیسا کہ قرآن میں ہے: 'اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ' ''جان کے بدلے جان'' (المائدہ ۵: ۴۵)۔ 'کل نفس ذائقة الموت' (ہر نفس نے موت کا مزہ چکھنا ہے)، اس لیے دیت مذکور میں بھی لفظ 'نفس' مرد اور عورت، دونوں کو شامل ہے اور دونوں کی دیت سو اونٹ ہے۔ ''المغنی'' (۷/ ۵۹۷) میں اس حدیث کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: 'فی النفس المؤمنة الدیة مائة من الإبل' (مومن نفس کی دیت سو اونٹ ہے)۔

صاحب ''المغنی''، ابن قدامہ کا قول ہے: یہ حدیث مطلق ہے اور 'دیة المرأة علی النصف من دیة الرجل' (عورت کی دیت مرد کی دیت سے آدھی ہے[4]) اس حدیث نے پہلی حدیث کو مقید کر دیا ہے۔ ابن المنذر اور ابن عبد البر کا قول ہے کہ اس بات پر صحابہ کا اجماع ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے آدھی ہے۔ ان دونوں کے علاوہ دوسرے علما نے ابوبکر الاصم اور ابن عُلَیّہ سے روایت کیا ہے کہ مرد اور عورت کی دیت برابر ہے اور انھوں نے اس حدیث سے دلیل پکڑی ہے کہ 'فی النفس المؤمنة مائة من الإبل'، جبکہ امام رازی نے ''تفسیر کبیر'' (۹/۲۳۳) میں کہا ہے کہ ابوبکر الاصم اور ابن عطیہ (یہ کتابت کی غلطی ہے صحیح ابن علیہ ہے) نے قرآن کی آیت 'وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَئًا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ' (النساء۴:۹۲) سے دلیل لی ہے اور اس پر اجماع ہے کہ اس آیت کا حکم مرد اور عورت، دونوں کے لیے ہے۔ چنانچہ لازمی ہے کہ حکم کا اطلاق مساویانہ ہوگا۔ یہ امام رازی کی راے ہے۔

۲۔ 'أن من قتل خطأ فدیته مائة من الإبل'، ''جو بھی غلطی سے قتل ہو جائے، اس کی دیت سو اونٹ ہے'' (ابوداؤد، رقم ۴۵۴۱۔ نسائی، رقم ۴۸۰۱۔ احمد، رقم ۶۶۶۳)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عبد اللہ بن عمرو فرماتے ہیں کہ جب مکہ فتح ہوا تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما ہوئے اور ارشاد فرمایا: 'من قتل خطأ' (۱۸۶، ۲۱۷، ۲۲۴) جو بھی غلطی سے قتل ہو جائے، اس کی دیت سو اونٹ ہے۔ نسائی کی اس روایت میں حرف تنبیہ 'ألا' آیا ہے، یعنی زمانۂ جاہلیت میں مرد اور عورت کی دیت میں فرق کی طرف توجہ دلاتے ہوئے خبردار کیا گیا ہے کہ یہ غلط ہے۔ اگر مرد غلطی سے قتل ہو جائے تو اس کے قتل کو قتل خطا کہیں گے۔ کیا عورت غلطی سے قتل ہو جائے تو اس کے قتل کو قتل خطا نہ کہا جائے گا؟ اس حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مرد اور عورت کی دیت سو اونٹ ہے۔ اس حدیث کا تعلق عہد نبوت کے آخری ایام، یعنی ۸ھ سے ہے۔

۳۔ 'المؤمنون تتکافأ دِمَاءُ هُمْ' (مومنوں کے خون برابر ہیں)۔

''المحلی'' (۱۰/۳۵۲-۳۵۳) میں اس حدیث کی روایت یوں بیان کی گئی ہے:

''قتادہ نے حسن البصری سے، انھوں نے قیس بن عباد سے روایت کی کہ میں اور ایک اور شخص علی بن ابی طالب کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ کیا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو کوئی ایسی وصیت کی ہے جو عام لوگوں کو نہیں کی؟ انھوں نے کہا: کوئی نہیں سوائے اس تحریر کے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ اس میں یہ حدیث تھی: ''مومنوں کے خون برابر ہیں، یعنی قصاص اور حرمات میں ان کے خون برابر ہیں۔ کسی شریف کو رذیل پر کوئی فضیلت نہیں۔ سب مقام و

---

[4] اس حدیث پر بعد میں بات ہوگی۔

مرتبہ میں یکساں ہیں۔اس کا تقاضا ہے کہ ہم مرد اور عورت میں کوئی تفریق نہ کریں، کیونکہ عورت کا خون مرد سے ارزاں نہیں ہوتا کہ اس پر اعتدا (زیادتی) کی سزا مرد سے کم تر ہو۔''

اگر یہ بات درست ہو تو پھر یہ حدیث کیسے درست قرار پائے گی؟ کیونکہ اس صورت میں مومنوں کے خون غیر مساوی ہوں گے۔ مسلمان سب کے سب کیا آزاد، کیا غلام اور کیا مرد اور کیا عورت، سب کا نسب ایک ہے۔سب پر ایمان کا رنگ چڑھا ہوا ہے اور ایمان کے نسب کے سوا وہ ہر نسب سے عاری ہیں۔ یہ مطلب ہے خون کے برابر ہونے کا۔

امام نسائی کے شارح جلال الدین السیوطی نے اس حدیث کے ضمن میں لکھا ہے کہ یہ خون قصاص میں بھی اور دیت میں بھی برابر ہوگا۔محمد فواد عبدالباقی ابن ماجہ کی شرح میں فرماتے ہیں: 'التکافؤ أي التماثل و التوافي'، یعنی 'تکافؤ' سے مراد پوری مماثلت ہے۔ان کا قول ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قصاص و دیت میں مرد اور عورت برابر ہیں۔ ''جامع الاصول من احادیث الرسول'' میں ابن اثیر کا قول ہے کہ حضور نے فرمایا کہ قصاص و دیت میں مرد اور عورت، امیر اور غریب اور اعلیٰ و ادنیٰ سب برابر ہیں۔علامہ یوسف القرضاوی اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علما کا قول ہے کہ مسلمانوں کے خون قصاص و حرمات میں ایک ہیں۔شریف کو رذیل پر کوئی فضیلت نہیں، کیونکہ حرمت، تحریم اور حقوق میں ان کا مرتبہ و مقام ایک جیسا ہے۔ یہ بات تقاضا کرتی ہے کہ ہم مرد اور عورت کے درمیان فرق روا نہ رکھیں، کیونکہ عورت کا خون مرد کے خون سے ارزاں نہیں ہوتا، اس پر زیادتی کی سزا مرد پر زیادتی کی سزا سے کم نہ ہوگی۔اگر یہ درست ہو تو حدیث کے معنی غلط ہوں گے، کیونکہ اس صورت میں مسلمانوں کے خون غیر مساوی ہوں گے۔''

اگر بدنی قصاص میں مساوات ہوگی تو مالی قصاص، یعنی دیت میں بھی مساوات ہوگی۔اس حدیث کو دلیل بنا کر امام ابوحنیفہ نے کہا ہے کہ اگر آزاد غلام کو قتل کر دے تو اس کے بدلہ میں آزاد کو قتل کیا جائے گا۔احناف نے تو اس حدیث کے مفہوم کو وسعت دے کر ساری انسانیت کو اس مساوات میں شامل کر لیا ہے۔وھبہ الزحیلی نے ''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' (۷/۵۷۱) میں کہا ہے کہ احناف کا قول ہے کہ اسلام اور کفر کی وجہ سے دیت میں کچھ اختلاف نہ ہوگا، کیونکہ خون تو سب کے برابر ہیں۔

۴۔إن الرجل يقتل بالمرأة ''عورت کے قتل کے بدلے مرد قتل کیا جائے گا'' (سنن البیہقی الکبریٰ، رقم ۱۵۶۸۲۔ سنن الدارمی، رقم ۲۳۵۴۔ نسائی، رقم ۴۸۵۳)۔

یہ حدیث، حدیث کی متعدد کتابوں میں بیان کی گئی ہے اور اگر دیت دینے والے درہم یا دینار میں دیت ادا کرنا چاہتے ہیں تو ایک ہزار دینار دیت ہوگی۔ مرد کے قصاص اور ایک ہزار دینار کا ذکر ایک ساتھ ان احادیث کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے کہ عہد رسالت میں مرد اور عورت کی دیت برابر تھی۔ اور دونوں کے لیے دیت سو اونٹ ہی تھی۔ اس سلسلہ میں امام ابن حزم نے ''المحلٰی'' (۱۰/۳۹) میں عبدالرزاق کے حوالہ سے روایت کی ہے کہ ان کو جریج نے خبر دی، ان کو ابن طاؤس نے اور اس نے اپنے باپ سے روایت کی کہ وہ کہا کرتے کہ سب لوگوں ('الناس' کا لفظ غور طلب ہے) کے لیے، خواہ وہ بستی والے ہوں، خواہ صحرانشین، دیت سو اونٹ ہے اور جن کے پاس اونٹ نہ ہو تو چاندی والوں کے لیے چاندی گائے والوں کے لیے گائے اور بکری والوں کے لیے بکری اور روئی کے پارچہ والوں کے لیے روئی، ہر قسم والا اس کے مارکیٹ کے نرخ کے مطابق اونٹ کی قیمت ادا کرے گا۔ یہ دیت 'الناس أجمعين' (سب انسانوں) کے لیے ہے۔ لفظ 'الناس' میں عورت اور مرد، دونوں شامل ہیں۔ ''تفسیر ابن عطیہ'' (۴/۱۷۷) میں ہے کہ دیت سو اونٹ سب لوگوں کے لیے تھی، ہاں اگر سونے اور چاندی والوں کے پاس اونٹ نہ ہوں تو دیت سونے اور چاندی میں ادا کی جاتی تھی، وہ اونٹ کی قیمت کے برابر سونا یا چاندی دیتے تھے، خواہ ہر اونٹ کی قیمت اس وقت کتنی ہی کیوں نہ ہو۔

''تفسیر المنار'' (۴/۳۳۳) میں ہے کہ عہد رسالت میں دیت کی قیمت ۸۰۰ دینار اور ۸ ہزار درہم تھی اور اہل کتاب کی دیت ان دنوں مسلمانوں کی دیت سے نصف تھی۔ حضرت عمر کے عہد خلافت تک یہی قیمت رہی۔ عہد فاروقی تک مسلمانوں کی دیت برابر تھی، صرف اہل کتاب کی دیت مسلمانوں سے نصف تھی۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

رضوان اللہ

بعد از موت

ـــــ ۳ ـــــ

اِحیا

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دنیا ے مذاہب میں تناسخ کے مقابل میں ایک ایسا نظریہ پایا جاتا ہے جس کو لوگوں کی بہت بڑی تعداد دینی عقیدے کے طور پر مانتی اور پھر اسی کی روشنی میں اپنے دنیوی معاملات اور مذہبی رسومات کو انجام دیتی ہے۔اس عقیدے کے مطابق بھی انسانی روح دوبارہ سے زندگی پائے گی، مگر اسی دنیا میں اور یہیں کے کسی مادی جسم میں نہیں، بلکہ اس کے لیے ایک نئی دنیا اور نیا جسم بنایا جائے گا جو نباتاتی اور حیواناتی کے بجاے انسانی خصائص ہی کا حامل ایک جسم ہو گا۔مزید یہ کہ جسم دیے جانے کا یہ عمل بار بار بھی نہیں ہو گا، بلکہ صرف ایک مرتبہ اور وہ بھی اس دنیا کے خاتمے کے بعد ہو گا۔اس عقیدے کو اِحیا (Resurrection) کا عقیدہ کہتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ احیا کا تفصیلی مطالعہ کریں، ہم ایک ضمنی بات عرض کرنا چاہتے ہیں۔اس عقیدے کے مطابق نئی زندگی دیے جانے کا عمل اپنی کامل صورت میں تو ایک مرتبہ اور وہ بھی اُس وقت ہو گا جب اس دنیا کی جگہ نئی دنیا آباد کی جائے گی، مگر بعض اوقات یہ عمل اپنی کم تر سطح پر اِس دنیا میں بھی ہوا کرتا ہے۔مرنے والے کو پھر سے زندگی ملتی ہے، وہ مردوں میں سے جی اٹھتا ہے اور پھر باقی ماندہ وقت اپنی سابق حیثیت ہی میں گزار کر چلا جاتا ہے۔احیا کی اس محدود اور ناقص شکل کو ہم ''Resuscitation'' کہہ سکتے ہیں۔یہ نظریہ بھی کسی نہ کسی رنگ میں مذہبی لوگوں کے ہاں موجود رہا ہے اور اس کی تاریخی حیثیت بیان کرنے کے لیے کتاب مقدس اور قرآن مجید میں بیان کردہ کئی واقعات کو پیش کیا

جا سکتا ہے۔مثال کے طور پر عہد نامہ عتیق میں ہے:

''اور اس (ایلیاہ) نے خداوند سے فریاد کی اور کہا: اے خداوند میرے خدا، کیا تو نے اس بیوہ پر بھی جس کے ہاں میں ٹکا ہوا ہوں، اس کے بیٹے کو مار ڈالنے سے بلا نازل کی؟ اور اس نے اپنے آپ کو تین بار اس لڑکے پر پسار کر خداوند سے فریاد کی اور کہا: اے خداوند میرے خدا، میں تیری منت کرتا ہوں کہ اس لڑکے کی جان اس میں پھر آجائے۔اور خداوند نے ایلیاہ کی فریاد سنی اور لڑکے کی جان اس میں پھر آ گئی اور وہ جی اٹھا۔''

(۱-سلاطین ۱۷:۲۰-۲۲)

دوبارہ زندہ ہو جانے کا ایک واقعہ انجیل میں اس طرح بیان ہوا ہے:

''جب وہ (یسوع) شہر کے پھاٹک کے نزدیک پہنچا تو دیکھو ایک مردہ کو باہر لیے جاتے تھے۔وہ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا، اور وہ بیوہ تھی۔اور شہر کے بہتیرے لوگ اس کے ساتھ تھے۔اسے دیکھ کر خداوند کو ترس آیا، اور اس سے کہا کہ مت رو۔پھر اس کے پاس آ کر جنازہ کو چھوا، اور اٹھانے والے کھڑے ہو گئے، اور اس نے کہا 'اے جوان میں تجھ سے کہتا ہوں اٹھ!'' تو وہ مردہ اٹھ بیٹھا، اور بولنے لگا، اور اس نے اسے اس کی ماں کو سونپ دیا۔'' (لوقا ۷:۱۲-۱۵)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

سیدنا مسیح علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کر دینے کا ذکر قرآن میں بھی موجود ہے۔فرق بس اتنا ہے کہ انجیل کے مذکورہ بیان سے ان کی بندگی کے بارے میں جو غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی، قرآن نے چند الفاظ کے بروقت استعمال سے اسے بالکل صاف کر دیا ہے۔ارشاد ہوا ہے:

وَاُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰہِ. (آل عمرٰن ۳:۴۹) ''اور میں مردوں کو اٹھا کھڑا کرتا ہوں، اللہ کے اذن سے۔''

مردے کو یوں زندہ کیا جانا، بذات خود کوئی عقیدہ یا مستقل نظریہ نہیں کہ جس پر اس حیثیت سے ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہو، بلکہ یہ آیندہ ہونے والے اِحیا ہی کی، جیسا کہ قرآن نے مزید وضاحت کی ہے، ایک عملی شہادت ہے۔اس کے ذریعے سے لوگوں کو تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ متنبہ رہیں، کسی روز اسی طرح سب مردوں میں جان ڈال دی جائے گی اور ان کو اپنے پروردگار کے سامنے جواب دہ ہونا ہوگا۔

اس سلسلے میں قرآن نے بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔قتل کے کسی معاملے میں جب ان سے کہا گیا کہ وہ ایک گائے کو ذبح کریں اور پھر اس پر قسمیں کھائیں تو انھوں نے جھوٹی قسمیں کھائیں اور ایک دوسرے پر الزام دھرنے لگے[1]۔اس پر اللہ نے فیصلہ کیا کہ وہ حقیقت کو ظاہر کر کے رہے گا۔چنانچہ اس نے حکم دیا کہ مردے کو اُسی

[1] یہ اصل میں قسامہ کا ایک واقعہ تھا۔بنی اسرائیل میں اندھے قتل کا سراغ لگانے کے لیے عام طور پر یہ طریقہ مقرر تھا کہ کسی

گائے کا ایک ٹکڑا مارا جائے جو قسمیں کھانے کے لیے ذبح کی گئی ہے۔ جب یہ عمل کیا گیا تو وہ مردہ پھر سے زندہ ہو گیا۔ مردے کو یوں زندہ کر دینے کا ایک مقصد قاتل کا پتا دینا تھا، اس کا دوسرا مقصد لوگوں کو آخرت میں دی جانے والی زندگی کی شہادت دینا بھی تھا۔ چنانچہ فرمایا: 'کَذٰلِکَ یُحۡیِ اللّٰہُ الۡمَوۡتٰی وَیُرِیۡکُمۡ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ'، ''اللہ اسی طرح مردوں کو زندہ کرے گا اور وہ تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھ سے کام لو[۲]۔''

قرآن میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ایک مشاہدے کا بھی ذکر ہوا ہے جو قلبی اطمینان کے لیے انھیں کرایا گیا۔ اللہ نے حکم دیا کہ تم چار پرندے لے کر انھیں اپنے ساتھ ہلا لو۔ پھر ان کو ذبح کر کے ہر پہاڑی پر ان میں سے ایک حصہ رکھ دو۔ اس کے بعد ان کو بلاؤ تو وہ دوڑتے ہوئے تمھارے پاس آجائیں گے۔ پھر اس سارے عمل کو دکھانے کی اصل غایت بیان کرتے ہوئے فرمایا: 'وَاعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ'، ''اور (آیندہ کے لیے) یہ بات خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ بہت زبردست ہے، (اس لیے وہ مردوں کو زندہ کر لے گا)، وہ بڑا حکمت والا ہے، (اس لیے وہ ان کو ضرور زندہ کرے گا)[۳]۔''

قرآن نے اسی طرح کا ایک اور واقعہ بیان کیا ہے جو ہے تو عالم رؤیا کا ایک مشاہدہ، مگر اس سے مذکورہ غایت پر روشنی ضرور پڑتی ہے۔ ایک صاحب جو غالباً حزقی ایل نبی تھے، کسی تباہ حال بستی پر سے گزرے۔ وہاں کی ویرانی کو دیکھا تو دل میں استعجاب پیدا ہوا کہ یہاں کے باسیوں کو خدا کس طرح زندہ کرلے گا۔ اس پر خدا نے انھیں سو سال کی موت دے کر پھر زندہ کیا اور ان سے پوچھا: تم کتنی مدت ایسے ہی پڑے رہے؟ انھوں نے اندازہ کیا کہ ایک دن یا اس سے کچھ کم، فرمایا: بلکہ تم پر سو سال اسی حالت میں گزر چکے۔ اس کے بعد ان کو کھانے پینے کے سامان اور گدھے کی طرف متوجہ کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ کھانے پینے کا سامان ویسے ہی پڑا ہے اور گدھا ہڈیوں کے ڈھانچے میں بدل گیا ہے۔ وہ اس بات پر ابھی حیران تھے کہ خدا نے ان کے سامنے گدھے کو زندہ کر کے بھی دکھا دیا۔ موت کے بعد زندہ کیے جانے کا یہ منظر دیکھنا ہی تھا کہ وہ پکار اٹھے: 'اَعۡلَمُ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ'، ''(کہ میرا تردد دور ہو گیا اور) میں نے جان لیا کہ اللہ واقعی سب کچھ کر دینے پر قادر ہے[۴]۔''

معلوم ہوا کہ مردوں کو اس طرح زندہ کر دینا خالص ایک خدائی فعل تھا اور اس کا مقصد بھی بالکل واضح تھا۔ نیز یہ

گائے کو ذبح کیا جاتا اور پھر اس کے خون پر قسمیں کھائی جاتیں۔

۲؎ البقرہ ۲: ۷۳۔

۳؎ البقرہ ۲: ۲۶۰۔

۴؎ البقرہ ۲: ۲۵۹۔

بھی واضح تھا کہ اس طرح دی جانے والی زندگی ابدی نہیں ہوتی، بلکہ دوبارہ سے جی اٹھنے والے اِن مردوں کو بھی کچھ مدت کے بعد عام لوگوں کی طرح مر جانا ہوتا ہے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ لوگوں نے جس طرح اس فعل کے مقصد سے یک سر اعراض کیا، اسی طرح اس کو الگ سے ایک عقیدے کی شکل بھی دے دی۔ چنانچہ اس سے خدا کی قدرت پر استدلال کیا ہوتا، الٹا بعض مردوں کو خدا مان لیا گیا اور اس بنیاد پر مذہبی رہنماؤں نے پوری پوری رام لیلائیں لکھ ماریں۔ اب کسی کے کرشنا نظروں سے اوجھل ہو کر امر ہو گئے ہیں تو کسی کے ہاں یسوع مسیح مردوں میں سے جی کر زندہ و جاوید ہو گئے ہیں۔ اور اگر کسی کے ''خدا'' ابھی تک زندہ نہیں ہو سکے تو کچھ حرج نہیں، مستقبل میں ان کے واپس آ جانے کی امید ضرور باقی ہے۔ ایک کنواری اس جھیل میں نہا کر حاملہ ہو گی جس میں ان کے پیشوا کا بیج رکھا گیا ہے۔ اس طرح وہ اس کے بیٹوں کو جنم دے گی جو دنیا میں آ جائیں گے تو سب دکھوں کو دور کر دیں گے۔ نظروں سے اوجھل ہو جانے والی طلسماتی روایت اور مستقبل کی سہانی امیدیں، جب دونوں گڈمڈ ہوئیں تو کچھ حضرات وہ بھی ہوئے جن کو اُس مسیحا کا شدت سے انتظار رہنے لگا جو مرے نہیں، بلکہ روپوش ہو گئے ہیں۔ قیامت سے پہلے وہ بھی ظاہر ہو جائیں گے، خدائی علم کو بلند کریں گے اور ظلم کی ہر روایت کو توڑ کر رکھ دیں گے۔ گویا مذہبی داستانوں کا ایک سلسلہ ہے جو مردوں کو زندہ کرنے کے خدائی فعل اور اس کے مقصد سے انحراف کرتے ہوئے گھڑ لیا گیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بہر حال، اِحیا کی اس ضمنی گفتگو کے بعد ہم سلسلۂ کلام وہیں سے جوڑتے ہیں جہاں سے یہ ٹوٹا تھا۔ ہم نے دیکھ لیا تھا کہ عقیدۂ اِحیا کیا ہے اور تناسخ سے یہ کس طرح مختلف ہے۔ اب ہم اس کی تاریخ اور مختلف ادیان میں اس کے بارے میں پائی جانے والی تعلیمات کا ذکر کرتے ہیں۔

عقیدۂ احیا کی تاریخ

احیا کے بارے میں اگر کہا جائے کہ انسانی تاریخ کا یہ قدیم ترین عقیدہ ہے تو یہ کہنا بے جا نہیں ہو گا، اس لیے کہ جس طرح معلوم تاریخ اس کی اطلاع دیتی اور آج کی مذہبی روایتیں اس کی شہادت دیتی ہیں، اسی طرح سینہ بہ سینہ علم، گرد میں اَٹی ہوئی آڑھی ترچھی لکیریں اور صدیوں پرانے کتبات بھی اس کے قدیم ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ اس عقیدے کی ابتدا اس طرح نہیں ہوئی کہ کسی پنڈت اور سوامی، کسی ربی اور پادری یا کسی فقیہ اور صوفی نے اس کو بنایا اور پھر گرد و پیش میں رواج دے دیا ہو، بلکہ یہ انسان کی عقل کا ابتدائی تجزیہ اور اس کے شعور کی اولین دریافت ہے۔ نیز یہ عقیدہ چند ادیان تک محدود، کسی خاص نسل اور مقام سے متعلق رہا ہو، ایسا بھی نہیں ہے، بلکہ یافث کی نسل ہو یا پھر

حام وسام کی اولاد، دجلہ وفرات کے باسی ہوں یا نیل وہمالا کے رہایشی، حتیٰ کہ دین ابراہیمی کی ہر شاخ، ان سب میں یہ عقیدہ کسی نہ کسی رنگ میں موجود رہا ہے۔ چنانچہ ان حقائق کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس عقیدے کی تاریخ اتنی ہی پرانی اور مسلسل ہے، جتنی خود انسان کی اپنی تاریخ۔

اگر یہ بات طے شدہ مان لی جائے کہ احیا کا عقیدہ شروع سے چلا آتا ہے تو تناسخ پر اس کی پیدایش کے حوالے سے ہونے والے تمام اعتراضات، کم سے کم اس عقیدے پر وارد نہیں ہوتے۔ اس لیے اب ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس کی تفصیلات کیا ہیں اور مختلف مذاہب میں اس کے بارے میں پائی جانے والی تعلیمات کیا کچھ ہیں۔ اس سلسلے میں بھی تمام ادیان کا استقصا کرنے کے بجاے ہمیں صرف ابراہیمی ادیان تک اپنی بحث کو محدود رکھنا ہے۔

یہودیت اور عقیدۂ احیا

یہود کی روایتی سرکشی، سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے کھلا انحراف اور اپنے چنیدہ قوم ہونے کا بے جا زعم، یہ وہ بنیادی عامل تھے جن کی وجہ سے ان کا مذہب بہت جلد اپنی حقیقت کھو بیٹھا اور محض ایک قوم اور اس کی عصبیت کا ترجمان بن کر رہ گیا۔ ان کے ہاں مذہبی اعمال اور رسومات کا مقصد اب صرف یہ تھا کہ کسی طرح دنیا میں کامیابی مل سکے اور قومی حیثیت میں ایک برتر مقام حاصل کیا جا سکے۔ جہاں تک فرد کی ذاتی نجات کا معاملہ ہے، اس کی حیثیت ان کے نزدیک ثانوی یا اس سے بھی کچھ کم رہ گئی تھی۔ یہی وجہ ہوئی کہ ان کے ابتدائی دور کے لٹریچر میں حیات بعد از موت کی تفصیلات ناپید، مگر ان کے برگزیدہ اور چنیدہ ہونے کا زعم کافی پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ تورات میں جو پانچ کتابوں کا مجموعہ ہے، احیاے موتیٰ کا ذکر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ بس موت کے بعد ایک طرح کی زندگی کا تصور ہے، جو اس میں پایا جاتا ہے۔ کتاب پیدایش میں ہے:

> ''تب ابرہام (علیہ السلام) نے دم چھوڑ دیا اور خوب بڑھاپے میں نہایت ضعیف اور پوری عمر کا ہو کر وفات پائی اور اپنے بزرگوں میں جا ملا۔'' (۲۵: ۸)

''اپنے بزرگوں میں جا ملا''، یہ الفاظ صرف یہ بتا رہے ہیں کہ موت کے بعد معاملہ بالکل ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ ایک نوعیت کی زندگی، بہر حال مردوں کو حاصل رہتی ہے۔[۵]

البتہ، تورات کے بجاے کتاب مقدس کے دوسرے مقامات پر اس بارے میں کچھ زیادہ وضاحت پائی جاتی

۵؎ انھی سے ملتے جلتے الفاظ تورات کے دوسرے مقامات پر بھی بہ آسانی دیکھ لیے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر، کتاب پیدائش کا باب ۲۵ آیت ۱۷ اور باب ۴۹ آیت ۳۳۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ہے۔ایک جگہ یوں بیان ہوا ہے:

''وہ کون سا آدمی ہے جو جیتا ہی رہے گا اور موت کو نہ دیکھے گا اور اپنی جان کو پاتال کے ہاتھ سے بچا لے گا؟''

(زبور ۸۹:۴۸)

کتاب مقدس میں اس طرح کے مواقع پر ایک عبرانی لفظ ''Sheol'' استعمال ہوتا ہے۔عام طور پر مترجمین اس کا ترجمہ 'پاتال' یا پھر 'قبر' سے کرتے ہیں۔ یہ مردوں کے رہنے کے لیے انڈر ورلڈ قسم کی ایک جگہ ہے، جہاں انھیں احیا سے پہلے رکھا جاتا ہے۔

یہ موت کے متصل بعد زندگی کا تصور ہوا، اب دیکھتے ہیں کہ مردوں کو باقاعدہ طور پر نئی زندگی دیے جانے کے بارے میں پرانا عہد نامہ کیا کہتا ہے۔ارشاد ہوا ہے:

''خداوند مارتا ہے اور جلاتا ہے۔ وہی قبر میں اتارتا اور اس سے نکالتا ہے۔'' (ا-سموئیل ۲:۶)

مردوں کا یہ اِحیا، ایک اور مقام پر یوں بیان ہوا ہے:

''تیرے مردے جی اٹھیں گے۔ میری لاشیں اٹھ کھڑی ہوں گی۔تم جو خاک میں جا بسے ہو، جاگو اور گاؤ، کیونکہ تیری اوس اُس اوس کی مانند ہے جو نباتات پر پڑتی ہے، اور زمین مردوں کو اگل دے گی۔'' (یسعیاہ ۲۶:۱۹)

مردوں میں دوبارہ روح پھونکنے کا مقصد، کیا ان کی جزا اور سزا ہے، اس کی وضاحت ذیل کی عبارت سے بہ خوبی ہو جاتی ہے:

''اور جو خاک میں سو رہے ہیں،ان میں سے بہتیرے جاگ اٹھیں گے۔بعض حیات ابدی کے لیے اور بعض رسوائی اور ذلّتِ ابدی کے لیے۔'' (دانیال ۱۲:۲)

مذکورہ حوالہ جات اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ یہودی لٹریچر میں بہت کچھ گھپلا ہو جانے کے باوجود اِحیا کا عقیدہ اس قدر واضح ہے کہ یہودیت کے حوالے سے اس کا انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں، اور کچھ لوگوں کا یہ دعویٰ سراسر غلط ہے کہ یہ عقیدہ کتاب مقدس کا نہیں، بلکہ یہودیت کے اندر بعد میں پیدا ہو جانے والا عقیدہ ہے۔

مسیحیت اور عقیدۂ اِحیا

جہاں تک مسیحی دنیا کا معاملہ ہے، وہ یہود کے برعکس احیاے موتیٰ کا ایک واضح تصور رکھتی اور ان کی کتابیں اس کے بارے میں اپنے اندر بہت سے شواہد رکھتی ہیں۔مسیحی حضرات چونکہ پرانا عہد نامہ بھی عام طور پر مانتے ہیں، اس لیے احیا کے جو دلائل یہودیت کے حوالے سے بیان ہوئے، وہ ان کے ہاں بھی حجت ٹھیرتے ہیں، تاہم مزید وضاحت

کے لیے ہم یہاں عہد نامہ جدید سے بھی کچھ حوالہ جات نقل کیے دیتے ہیں۔ انجیل مقدس میں بیان ہوا ہے:

''اس سے تعجب نہ کرو، کیونکہ وہ وقت آتا ہے کہ جتنے قبروں میں ہیں، اس کی آواز سن کر نکلیں گے۔ جنھوں نے نیکی کی ہے، زندگی کی قیامت کے واسطے اور جنہوں نے بدی کی ہے، سزا کی قیامت کے واسطے۔[٦]''

اناجیل کے علاوہ دوسرے مقامات پر یہ عقیدہ اس طرح بیان ہوا ہے:

''...اور خدا سے اسی بات کی امید رکھتا ہوں جس کے وہ خود بھی منتظر ہیں کہ راست بازوں اور ناراستوں، دونوں کی قیامت ہوگی۔[۷]''

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

٦۔ یوحنا ۵: ۲۸-۲۹۔ لوقا کی انجیل باب ۱۴ کی آیت ۱۴ اور انجیل متّی باب ۲۵ کی آیت ۳۱ سے ۴۶ تک میں بھی اس مضمون کو دیکھا جا سکتا ہے۔

۷۔ اعمال ۲۴: ۱۵۔ اس کے علاوہ ۲-کرنتھیوں باب ۵ آیت ۱۰ اور عبرانیوں باب ۹ آیت ۲۷ میں بھی مردوں کے جی اٹھنے اور ان کی جزا و سزا کا ذکر موجود ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی

ایک سخت گیر آقا

ایک آقا تھا ہمیشہ نوکروں پر سخت گیر
درگذر تھی اور نہ ساتھ اُن کے رعایت تھی کہیں
بے سزا کوئی خطا ہوتی نہ تھی اُن کی مُعاف
کام سے مُہلت کبھی ملتی نہ تھی اُن کے تیئں
حُسنِ خدمت پر اِضافہ یا صِلہ تو درکنار
ذکر کیا نکلے جو پھوٹے مُنہ سے اُس کے آفریں
پاتے تھے آقا کو وُہ۔ ہوتے تھے جب اُس سے دوچار
نتھنے پھولے۔ مُنہ چڑھا۔ ماتھے پہ بل۔ ابرو پہ چیں
تھی نہ جُز تنخواہ نوکر کے لیے کوئی فُتوح
آ کے ہو جاتے تھے خائن جو کہ ہوتے تھے امیں
رہتا تھا اک اک شرائط نامہ ہر نوکر کے پاس
فرض جس میں نوکر اور آقا کے ہوتے تھے تعیں
گر رعایت کا کبھی ہوتا تھا کوئی خواستگار
زہر کے پیتا تھا گھونٹ آخر بجائے انگبیں

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حُکم ہوتا تھا شرائط نامہ دِکھلاؤ ہمیں
تا کہ یہ درخواست دیکھیں واجبی ہے یا نہیں
واں سِوا تنخواہ کے تھا جِس کا آقا ذِمّہ دار
تھیں کریں جتنی وُہ ساری نوکروں کے ذِمّہ تھیں
دیکھ کر کاغذ کو ہو جاتے تھے نوکر لا جواب
تھے مگر وہ سب کے سب آقا کے مارِ آستیں
ایک دِن آقا تھا اِک مُنہ زور گھوڑے پر سوار
تھک گئے جب زور کرتے کرتے دستِ نازنیں
دفعتہً قابو سے باہر ہو کے بھاگا راہوار
اور گِرا اسوار صدرِ زین سے بالائے زمیں
کی بہت کوشش نہ چھوٹی پاؤں سے لیکن رکاب
کی نظر سائیس کی جانب کہ ہو آ کر مُعیں
تھا مگر سائیس ایسا سنگ دِل اور بے وفا
دیکھتا تھا اور ٹس سے مس نہ ہوتا تھا لعیں
دور ہی سے تھا اُسے کاغذ دکھا کر کہہ رہا
دیکھیے سرکار اس میں شرط یہ لِکھّی نہیں

(سفینۂ اردو، مرتب: مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی ۱۴۲-۱۴۴)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org